رموزِ بیخودی کے مباحث

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

اقبال کی کتاب اسرارِ خودی کے بعض نظریات کو سطحی فہم رکھنے والے نقادوں نے نظرِ تحسین سے نہ دیکھا۔ روایتی تصوف کے دل دادگان کو اس سے جا بجا ٹھوکر لگی۔ ہمارے ادب میں تو خودی ایک مذموم چیز تھی اور تصوف و اخلاق اس کو ابلیسانہ چیز سمجھتے تھے۔ فارسی اور اُردو ادب میں نفس انسانی کے ایزدی جوہر کے متعلق تو بہت کچھ ملتا ہے لیکن ہر جگہ تلقین یہی ہے کہ انسان اپنی خودی کو سوخت کر کے ہی اس جوہر کو اُجاگر کر سکتا ہے۔ خودی کی پرستش گناہ ہے اور خدا پرستی کے مخالف ہے:

تجھ کو خودی پسند ہے مجھ کو خدا پسند　　تیری جدا پسند ہے میری جدا پسند

اس تصور میں یہ 'انا' یا 'میں' یا 'ہم' پندار کا ایک بت ہے اور تمام بتوں کا قلع قمع کرنے کے بعد آخر میں یہی سنگ گراں معرفت میں سنگ راہ بن جاتا ہے:

گو لاکھ سبک دست ہوئے بت شکنی میں　　ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

وحدت وجود کا فلسفہ، جو اسلامی شاعری اور تصوف کا مرکز و محور بن گیا، زیادہ تر خودی سوز ہی ہے۔ کیونہ اس کے اندر مخلوقات کی حیثیت محض ظلی ہے۔ اقبال نے روایتی تصوف کے خلاف جہاد اسرارِ خودی ہی سے کیا اور عمر کے آخری لمحوں تک یہ جہاد جاری رہا۔ مابہ النزاع خودی ہی کا مسئلہ تھا۔ اقبال خدا کو خودی میں جذب کرنے کی تلقین کرتا تھا اور تصوف خودی کو خدا میں گم کرنے کی تعلیم دیتا تھا۔ اسرارِ خودی سے بہت سے قارئین نے دھوکا کھایا اور سمجھا کہ یہ قوت اور تکبر کی تعلیم ہے اور اس میں انسان کی خودی کو خدا بنا دیا گیا ہے۔ اسرارِ خودی میں خدا کہیں نمایاں معلوم نہیں ہوتا، انسانی خودی وہاں خلاق بن گئی ہے۔ ان نقادوں کو یہ علم نہ تھا کہ اقبال اس سے اچھی طرح آشنا تھا کہ بے خودی بھی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے۔ اگرچہ بے خودی کا مفہوم بھی اس کے نزدیک روایتی مفہوم سے بہت مختلف تھا۔ اقبال کے حکیمانہ اور دینی تصورات کا فقط ایک پہلو اسرارِ خودی میں پیش ہوا تھا۔ اس کی تکمیل کے لیے دوسرے پہلو کو

پیش کرنا لازمی تھا۔ رموزِ بیخودی، اسرارِ خودی کا تکملہ ہے۔ اقبال کے نظریات حیات میں بحیثیت مجموعی ایک توازن موجود ہے۔ اگرچہ کلام کے بعض حصوں کو الگ الگ کر دیکھیں تو بعض اوقات فقط ایک پہلو کسی قدر شدت اور مبالغے کے ساتھ نظر کے سامنے آتا ہے۔

رموزِ بیخودی کی تمہید میں ربط فرد و ملت کے متعلق اقبال اپنا زاویہ نگاہ پیش کرتا ہے۔ یہ مسئلہ نفسیات 'اخلاقیات' سیاسیات اور معاشیات کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کے متعلق اختلاف زندگی کے تمام شعبوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ فرد کو ایک ایٹم سمجھ کر جو نفسیات لکھی گئی وہ حقیقت حیات سے بہت دور ہو گئی۔ سادہ اخلاقی تصورات بھی اس کے لیے نا قابل فہم ہو گئے اور سجوک جیسے اخلاقیات پر ضخیم تصنیف کرنے والے فلسفی آخر میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ کیوں ایک فرد اپنی ذاتی مسرت کو دوسروں کے لیے قربان کرے۔ کانٹ کی اخلاقیات بھی آخر میں بے بنیاد ہو گئی اور اس نے اس عقیدے کا سہارا لیا کہ اگر تلافی کرنے والے خدا اور بعد الموت کا عقیدہ نہ ہو تو فرد کی فرض شناسی اور جماعت کے اغراض کے لیے اس کی ذاتی سعادت و مسرت کی قربانی کی کوئی عقلی تاسیس ممکن نہیں۔ جرمن فلسفی شٹیرنر اور نطشے کی طرح بعض حکماء نے فرد کو مطلق العنان کرنے کی تلقین کی تا کہ جماعت کے حدود و قیود اور اوامر و نواہی اس کی شخصیت کے بے روک ارتقاء میں خلل انداز نہ ہوں۔ دوسری طرف ہیگل جیسے فلاسفہ نے جماعت اور مملکت کو معبود بنا دیا اور فرد کی انفرادیت وہاں ایک بے حقیقت سا مظہر رہ گئی۔ اس کا اثر معاشیات و سیاسیات پر بہت گہرا پڑا۔ کارل مارکس نے اپنے فلسفے کا ڈھانچا ہیگل سے اخذ کیا اور اس کا عملی نتیجہ وہ اشتراکیت ہے جہاں فرد کی آزادی ضمیر اور آزادی عمل ایک گناہ کبیر ہے۔ مغرب میں حقوق طلبی کے جوش و خروش میں فرد نے جماعت کو اپنا حریف سمجھا، رفتہ رفتہ وہ مذہب سے بھی برگشتہ ہو گیا جو فرد کو جماعت کے ساتھ وابستہ رکھنا چاہتا تھا۔ یہ تھا کشاکش افراط و تفریط کا نتیجہ تھی۔

اسلام اعتدال اور توازن کا نام ہے۔ ادیان میں فرد و ملت کے ربط کا مسئلہ عمدہ طور پر اسلام نے حل کیا تھا۔ اسلام فرد کے نفسیات کے کسی پہلو کو جماعت کے مفاد سے الگ نہیں کرتا۔ اس کی تمام عبادات میں اجتماعی عنصر بہت نمایاں ہے۔ نماز ہو یا روزہ، سب میں فرد جماعت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کے باوجود اسلام نے بڑے زور و شور سے آزادی ضمیر کی تلقین کی اور کہا کہ دین، جس میں عقیدہ اور طریق زندگی شامل ہے، کسی جبر کو گوارا نہیں کرتا۔ جو چیز اختیار سے قبول نہیں کی گئی اس کی کچھ قدر و قیمت نہیں۔ رہبانی مذاہب میں اخلاق اور روحانیت افرادی رہ گئے تھے۔ ایک طرف خدا اور دوسری طرف فرد جو غار میں یا صحرا میں جماعت سے بے نیاز ہو کر خدا کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔

اقبال کے ہاں 'ربط فرد و ملت' کا نظریہ اسی اسلامی زاویہ نگاہ سے اخذ کردہ ہے۔ جماعت کے ساتھ

تمام نفسیاتی روابط کو ساقط کر کے نفس انسانی کی باقی ماندہ حقیقت کو دیکھیں تو وہ صفر رہ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اقبال نے بہت پہلے کہا تھا کہ ''وجود افراد کا مجازی'' ہے یعنی فرد کی، جماعت سے ربط کے بغیر کوئی حیثیت نہیں۔ لیکن جماعت کا یہ ہمہ گیر رابطہ انسان کی انفرادی خودی کو سوخت نہیں کرتا، بلکہ اس کی پرورش کرتا ہے۔ ہر شاخ اور ہر پتے کی اپنی بھی ایک مخصوص حیثیت ہے، لیکن شجر سے منقطع ہو کر نہ شاخ میں روئیدگی رہ سکتی ہے اور نہ پتا سرسبز رہ سکتا ہے:

پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

تمام نوع انسان کی وحدت کی تعلیم قرآن میں موجود تھی کہ سب انسان ایک نفس واحدہ سے سرزد ہوئے ہیں۔ گویا تمام نوع انسان ایک جسم ہے اور مختلف افراد اس کے اعضا ہیں۔ اسی قرآنی تصور کو ان اشعار میں ادا کیا گیا ہے:

بنی آدم اعضاے یک دیگر اند کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار دگر عضوہا را نہ ماند قرار

اگر کسی عضو میں ایسی انانیت پیدا ہو جائے کہ وہ دوسرے اعضا سے تعاون لا حاصل ایثار سمجھے تو خود وہ عضو معطل ہو جائے گا۔ یہ تمثیلی حکایت حکمت آموز ہے کہ انسانی جسم کے اعضا میں بے بصری سے ایک مرتبہ یہ خیال پیدا ہو گیا کہ ہم تو سب جدوجہد کرتے رہتے ہیں لیکن یہ پیٹ نکھٹو، ناکردہ کار ہماری محنت سے پیدا شدہ رزق کو اپنے اندر ڈال کر خود لطف اٹھاتا ہے۔ اس نکھٹو کا کامل مقاطعہ کرنا چاہیے۔ تمام اعضا نے رزق کی کوشش چھوڑ دی، پیٹ میں کچھ نہ گیا تو سب کی حالت زار ونزار ہو گئی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ہم بے جان کیوں ہو رہے ہیں۔ آخر دماغ نے ان بے وقوفوں کو سمجھایا کہ شکم سمیت تم سب ایک ہی جان کے مظاہر اور اس کے خدمت گزار ہو۔ ہر ایک کا کام اسے خود بھی نفع پہنچاتا ہے اور کل جسم کو بھی۔ جماعت کے ساتھ ہی ربط رکھنے سے عضو میں زندگی اور قوت ہے۔ فرد و جماعت کے ربط کی اس سے بہتر مثال ڈھونڈنا مشکل ہے۔ علامہ اقبال بھی اسی تصور سے آغاز کرتے ہیں:

فرد را ربط جماعت رحمت است جوہر او را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش رونق ہنگامہ احرار باش

اس کے بعد ایک حدیث نبویؐ کے حوالے سے کہا ہے کہ شیطان جماعت سے دور رہتا ہے۔ فرد و قوم ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔ فرد و ملت کا احترام و نظام ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے۔ فرد کا جماعت میں گم ہونا خودی کو سوخت کرنا نہیں بلکہ قطرے کا قلزم بننا ہے۔ زندگی کے اقدار کا سرمایہ ملت ہی کے گنجینے میں ہوتا ہے۔ نوع انسان جو کچھ قرون میں یہ دوران ارتقاء پیدا کرتی رہی ہے، فرد اس تمام ثروت کا مالک بن

جاتا ہے اور انسانیت کے مستقبل کی طرف بھی جماعت ہی قدم بڑھاتی ہے۔ ماضی اور مستقبل اس کی ذات میں ہم آغوش ہیں۔ افراد پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں۔ لیکن جماعت باقی رہتی ہے۔ فرد کے اندر ترقی کی خواہش بھی جذبہ ملی سے پیدا ہوتی ہے اور خیر و شر کا معیار بھی حیات ملی کی پیداوار ہے۔ انسان کو حیوان ناطق کہتے ہیں لیکن فرد بے جماعت ناطق نہیں ہوسکتا۔ زبان جو ہزار ہا سال کے انسانی تجربات کی سرمایہ دار ہے، کسی ایک فرد کی پیدا کردہ چیز نہیں۔ یہ قیمتی ورثہ جماعت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ گرمی صحبت سے فرد میں ملت کی وسعت آجاتی ہے۔ تمام کثرت وحدت میں منسلک ہو جاتی ہے۔ لفظ کے اندر معنی کی ثروت جملے یا مصرعے کے دوسرے الفاظ سے متحد ہو کر ظہور پذیر ہوتی ہے۔ تنہا فرد کے مقاصد خور و نوش کے علاوہ اور کیا ہو سکتے ہیں۔ فرد کے مضمرات و ممکنات اگر معرض شہود میں آتے ہیں تو محض ملت کے ربط سے۔ ضبط و نظم سے زندگی کو نشو و نما حاصل ہوتا ہے۔ حقیقی آزادی جو معاون حیات و ارتقاء ہے وہ جماعتی پابندیوں ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح کہ ندی کے اگر کنارے نہ ہوں، جو اس کی روانی کو حدود کے اندر رکھتے ہیں، تو وہ ندی ہی نہیں بن سکتی۔ علامہ فرماتے ہیں کہ تو نے خودی اور بے خودی کے باہمی ربط کو نہیں پہچانا، اس لیے وہم و گمان میں مبتلا ہو گیا ہے اور ان کو باہم متضاد سمجھنے لگا ہے۔ تیری ذات کے اندر ایک جوہر نور ہے۔ اس نفس واحدہ میں دوئی نہیں۔ لیکن مظاہر حیات میں یہ وحدت من و تو کا امتیاز پیدا کر لیتی ہے۔ اس کی فطرت آزاد خود اپنی تکمیل کے لیے آئین کی زنجیریں بناتی ہے۔ اس جزو کے اندر ہمہ گیر قوت ہے۔ پیکارِ حیات اس شمشیر کے لیے سنگ فساں ہے:

غرض ہے پیکارِ زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا

اسی کو خودی کہتے ہیں اور اسی کا نام زندگی ہے۔ جماعت کے اندر گم ہو کر، یعنی بے خودی سے، یہ خودی اپنے آپ کو استوار کرتی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئین کے جبر نے اختیار فرد کو سوخت کر دیا ہے، لیکن محبت اسی کا نام ہے کہ محبّ محبوب کی ذات سے ہم آہنگ ہو جائے۔ خود شکنی سے کس طرح خودی مضبوط ہوتی ہے؟ استدلال کے لیے یہ نکتہ آسانی سے قابل فہم نہیں، اس میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے:

نکتہ ہا چوں تیغ پولاد است تیز گر نمی فہمی ز پیش ما گریز

اس تمہید کے بعد اقبال نے اس نکتے کی وضاحت کی ہے کہ انسان کی فطرت میں یکتائی کا جوہر بھی ہے لیکن اس کی حفاظت انجمن آرائی سے ہی ہوتی ہے۔ افراد خود اپنی تکمیل ذات کے لیے اپنے آپ کو ایک لڑی میں پرو لیتے ہیں۔ پیکار حیات میں ایک دوسرے کے تعاون کی ضرورت پیش آتی ہے۔ افلاک پر نظام انجم بھی جذب باہم سے قائم ہے۔ انسانی افراد بھی اسی آئین سے قیام و ثبات حاصل کرتے ہیں۔ ابتدائی حالت میں انسان جب دشت و جبل میں آوارہ تھے تو زندگی کی قوتیں خوابیدہ تھیں، آرزوئیں محدود تھیں:

گوشمال جستجو نا خوردۂ زخمہ ہائے آرزو نا خوردۂ

خون میں گرمی نہیں تھی۔ دیو پری کے اندیشے سے لرزاں تھے۔ عقل وفکر نے بھی ماحول پر غلبہ حاصل نہ کیا تھا۔ برق و رعد سے خائف تھے۔ خودرو چیزیں کھا کر گزارہ کر لیتے تھے۔ اپنی کوشش سے فطرت سے کچھ نہ حاصل کر سکتے تھے۔ ایک انفعالی کیفیت تھی۔ جو کچھ میسر آ گیا اس پر قناعت کر لی۔ اس حالت میں انسان اس وقت نکلا جب کسی جماعت میں ایک مرد صاحب دل پیدا ہوا۔

یہ قرآنی تصور ہے کہ آدمیت کا آغاز نبوت سے ہوا ہے۔ بعض حکما نے کہا ہے کہ ہر علم وفن کا آغاز بھی وحی ہی کی بدولت کی ہوا۔ ایسا شخص انسانوں کو انتشار سے نکال کر ان میں وحدت پیدا کرتا ہے۔ ''تا دوئی میرد یکی پیدا شود''۔ ایسے مرد صاحب دل کا انداز نظر بالکل تازہ ہوتا ہے۔ وہ ہر شے کو ایک نئی بصیرت سے دیکھتا ہے اور اس سے نئے نتائج اخذ کرتا ہے۔ اس کے اندر زندگی کی حرارت ہوتی ہے جس کی چنگاریاں بے شمار قلبوں میں شعلے پیدا کرتی ہے۔ اس کی بدولت عقل کو بھی ایک نیا پیرایہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو کھوٹے اور کھرے میں تمیز کرنا سکھاتا ہے۔ وہ زندگی کے اقدار کی نئی تقدیر کرتا ہے۔ وہمی معبودوں کی پرستش سے انسان کو نجات دلاتا ہے۔ مادّی فطرت کو قوتوں کا خوف دلوں سے زائل کرتا ہے اور انسان میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ تو خدائے خلاق واحد کے سوا کسی کا بندہ نہیں۔ اس کے طفیل میں انسان ایک جماعت بن جاتے ہیں اور توحید الٰہی وحدت انسانی میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ تمام زندگی کے لیے ایک مقصود معین ہو جاتا ہے:

تا سوے یک مدعایش می کشد حلقہ آئیں بپایش می کشد
نکتہ توحید باز آموزدش رسم و آئین نیاز آموزدش

اس قسم کے توحید آموز اور وحدت آفریں تلمیذ الرحمان کو اسلامی اصطلاح میں نبی کہتے ہیں۔ از آدم تا ایں دم نوع انسان نے جو ترقی کی ہے اور انسان کی بصیرت اور قوت میں جو اضافے ہوئے ہیں، سب کا سرچشمہ نبوت ہی ہے۔

اس کے بعد، ارکان اساسی ملیہ اسلامیہ، کے عنوان کے تحت رکن اوّل توحید کی شرح ہے۔ انسانی عقل ابتدائی کوششوں میں اپنے ماحول میں اشیا وحوادث کا فرداً فرداً ادراک کر کے ان کے ساتھ کوئی ہنگامی توافق پیدا کرتی رہی۔ ابھی تک ایسا شعور پیدا نہ ہوا تھا جو مظاہر کی گونا گونی اور کثرت کو کسی وحدت سے منسلک کر سکے۔ عقل کا پہلا ارتقائی قدم توحید کی بدولت اٹھا، ورنہ عقل کے لیے خود اپنا مقصود واضح نہ تھا۔ فطرت کی تسخیر فہم فطرت کے ساتھ وابستہ ہے اور اس فہم کا کام حوادث کی کثرت میں آئین کی وحدت تلاش کرنا ہے:

در جہان کیف و کم گردید عقل پے بہ منزل برد از توحید عقل
ورنہ این بے چارہ را منزل کجاست کشتی ادراک را ساحل کجاست

کم فہم لوگ دین اور دانش کو الگ الگ بلکہ متضاد چیزیں سمجھتے ہیں۔ اگر نکتہ توحید ان کی سمجھ میں آجائے تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہو کہ توحید کی پیدا کردہ وحدت کوشی ہی دین اور حکمت دونوں کا سرچشمہ ہے اور تمام قسم کی قوتیں اسی سے پیدا ہوتی ہیں:

دین ازو، حکمت ازو، آئیں ازو زور ازو، قوت ازو، تمکیں ازو

عالموں کی حیرت اور عاشقوں کی قوت عمل اسی زاویہ نگاہ کا نتیجہ ہیں۔ یہی عقیدہ خاک کو اکسیر بناتا ہے۔ اس سے انسان کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے۔ انسان راہ حق میں گرم رو ہو جاتا ہے۔ شک اور خوف کی جگہ یقین محکم پیدا ہوتا ہے، چشم بصیرت پر ضمیر کائنات کا انکشاف ہوتا ہے۔

کلمہ توحید ہی ملت بیضا کے تن میں بطور جان ہے۔ یہی عقیدہ ملت کا شیرازہ بند ہے۔ اسی سے زندگی میں قوت کا اضافہ ہوتا ہے۔ اسی سے تو وہ گل دل بن جاتا ہے اور دل میں سے اگر یہ نکل جائے تو دل مٹی ہو جاتا ہے۔ مسلمان کی اصلی دولت یہی ہے۔ اسی توحید نے اسود و احمر کی تمیز مٹائی اور بلال حبشی (رضی اللہ عنہ) فاروق (رضی اللہ عنہ) اور ابوذر (رضی اللہ عنہ) کا ہمسر ہو گیا۔ ملت نہ جغرافیائی چیز ہے اور نہ نسلی یا لسانی۔ بقول شاعر ''ہم دلی از ہم زبان بہتر است'' ملت دلوں کی یک رنگی اور ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے اور یہ بات توحید ہی کی برکت سے ظاہر ہوتی ہے:

ملت از یک رنگی دلہاستے روشن از یک جلوہ سیناستے
قوم را اندیشہ ہا باید یکے در ضمیرش مدعا باید یکے

ملت اسے کہتے ہیں جس میں خیر و شر اور خوب و زشت کا معیار یکساں ہو۔ یہ اتحاد خدائے واحد ہی کی بخشی ہوئی بصیرت کا نتیجہ ہو سکتا ہے، ورنہ ہر شخص خود اپنے لیے معیار بن جائے اور انسانی وحدت کا شیرازہ بکھر جائے۔ بعض ملتوں نے اپنی تقدیر کو وطن کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ بعض نے اتحاد ملت کی تعمیر نسل و نسب کی بنیادوں پر قائم کی ہے۔ لیکن وطن پرستی خدا پرستی نہیں، وہ ایک خطہ ارض کی پرستش ہے، اسی طرح نسب کا مدار جسمانی توارث پر ہے، لیکن انسان کی ماہیت جسم نہیں بلکہ روح ہے۔ ملت اسلامیہ کی اساس نفسی ہے۔ یہ ایک غیر مرئی رشتہ ہے، جس طرح تجاذب انجم کے تار کسی کو نظر نہیں آتے مگر وہی نظام انجم کے قوام ہیں۔ اس قسم کی وحدت نفسی توحید پرستوں کے سوا کہیں اور نظر نہیں آتی۔

قرآن نے جہاں نفس مطمئنہ اور نجات یافتہ، خدا رس انسان کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے دو ہی صفات بالتکرار بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسا انسان یاس و حزن و غم سے پاک ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ کسی قسم کا

خوف اس کے دل میں نہیں رہتا۔ اسی صفت کا نام حریت ہے اور یہ توحید ہی کا ثمر ہے۔ مردِ موحد کبھی نا اُمید نہیں ہوسکتا کیوں کہ اس کے نزدیک نا اُمیدی کفر ہے۔ اُمید سے زندگی کی قوتیں پیدا اور استوار ہوتی ہیں اور یاس سم قاتل کا کام کرتی ہے۔ قطع اُمید سے انسان خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مایوس انسان کے عناصر سست ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ غم انسان کی جان کو کھا جاتا ہے مسلمانوں کو خدا اور رسولؐ نے ''لا تحزن'' کی تعلیم دی ہے اور نصب العین لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون قرار دیا ہے:

گر خدا داری ز غم آزاد شو　　از خیال بیش و کم آزاد شو

اسی قوت سے موسیٰ (علیہ السلام) فرعون کے مقابل میں کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کو غرقاب کرتا ہے۔ غیر اللہ کا خوف عمل کا دشمن ہے لیکن خدا پر یقین ہمت عالی کا منبع ہے۔ خوف سے فکر و عمل کی تمام قوتیں بے کار ہو جاتی ہیں اور انسان خود مسخر و مغلوب ہو جاتا ہے۔ جس شخص کو سست عمل دیکھو سمجھ لو کہ اس کے دل میں خوف نے جگہ کر لی ہے۔

جدید نفسیات نے کوئی پچاس قسم کے 'فوبیا' یعنی خوف کی قسمیں دریافت کی ہیں جو انسان کے تحت الشعور میں داخل ہو کر اس کے نفس میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا کرتی ہیں۔ 'نفسیات تحلیلی' ان چوروں کو قلب کے تہ خانوں سے نکالنے کی تجویزیں کرتی رہتی ہیں، لیکن خود ایک بڑا ماہر نفسیات جدید، ینگ اس کا اقرار کرتا ہے کہ خدا پر راسخ عقیدہ رکھنے والے ان خوفوں اور نفسی پیچیدگیوں سے بری ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا علاج عقیدہ توحید ہے:

ہر شے پنہاں کہ اندر قلب تست　　اصل او بیم است اگر بینی درست
لابہ و مکاری و کین و دروغ　　ایں ہمہ از خوف می گیرد فروغ

موحد کے دل بے ہراس کے متعلق ایک تمثیل پیش کی ہے کہ حزن و خوف سے بری انسان میں ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ حوادث کے تیر اس پر بے اثر ہو جاتے ہیں۔ تیر شمشیر سے کہتا ہے کہ میں کسی کے سینے میں داخل ہونے سے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ اس کے اندر دل یاس و بیم میں مبتلا ہے یا نہیں۔ جہاں میں نے دیکھا کہ یہ شخص مایوس اور ڈرپوک معلوم ہوتا ہے، وہاں میں دھڑلے سے اس کی خوں ریزی کرتا ہوں، لیکن اگر سینے کے اندر قلب مومن نظر آئے تو میں اس کی حرارت سے پگھل کر پانی ہو جاتا ہوں:

در صفائے او ز قلب مومن است　　ظاہرش روشن ز نور باطن است
از تف او آب گردد جان من　　ہمچو شبنم می چکد پیکان من

اس نظم میں بے خودی کا مفہوم اس لحاظ سے داخل ہے کہ جب خودی میں سے خوف و حزن کے عناصر ناپید ہو جائیں تو اس قسم کی بے خودی کی حالت مستی و مدہوشی کے مماثل نہیں ہوتی بلکہ حوادث کے مقابلے

میں نا قابلِ شکست حصن مدافعت بن جاتی ہے۔ خودی اور بے خودی میں کوئی تضاد نہیں رہتا۔ اسی خیال کو 'حکایت شیر و شہنشاہ عالمگیر' میں ایک تاریخی واقعے سے استوار کیا ہے۔ نماز عاشقاں میں ایک بے خودی کی کیفیت ہوتی ہے کیوں کہ نفس انسانی اپنے تئیں کلیتاً خدا کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس سپردگی کی بدولت اس میں بے حد قوت اور بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔ شیر نے عالمگیر پر دوران نماز میں حملہ کیا۔ کوئی معمولی انسان خوف زدگی میں شیر کا شکار ہو جاتا ہے یا بے اختیار فرار کی کوشش کرتا لیکن عالمگیر کی بے خودی میں خودی کی طاقت دیکھیے:

دست شہ نادیدہ خنجر برکشید　　شرزہ شیرے را شکم از ہم درید
دل بخود را ہے نداد اندیشہ را　　شیر قالیں کرد شیر بیشہ را

ایسے نفس میں خودنمائی کے ساتھ خودشکنی ہوتی ہے، لیکن یہی خودشکنی الٰہی قوتوں کی جاذب بن جاتی ہے:

ایں چنیں دل خود نما و خود شکن　　دارد اندر سینہ مومن وطن

بعض اوقات لوگوں کو لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون کی صفت پڑھتے ہوئے یہ گمان گزرتا ہے کہ ماسوا کا خوف معدوم ہونے پر بھی خدا کا خوف تو باقی رہتا ہے، اس لیے بندہ مومن مطلقاً لا خوف تو نہ ہوا۔ لیکن یہ دھوکا انسانی زبان کی کوتاہی سے پیدا ہوتا ہے۔ خدا کے خوف کے وہ معنی نہیں جو ماسوا کے خوف کے معنی ہیں۔ خدا کوئی ڈراؤنی چیز نہیں ہے جسے دیکھ کر انسان کانپنے لگے۔ وہ تو سراپا رحمت و شفقت ہے۔ خوف خدا کے معنی ہیں حکم خداوندی اور آئین الٰہی کی خلاف ورزی کے دردناک نتائج فطری ہیں۔ انھیں معنوں میں خوف خدا کو حکمت کا سرچشمہ کہا گیا ہے۔ ماسوا کا خوف تو انسان کو حواس باختہ اور عقل سوختہ کر دیتا ہے۔ خوف خدا کا نتیجہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ ایک فرمان بردار بچہ سراپا شفقت ماں باپ کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے سے گریز کرتا ہے تاکہ محبت کے آبگینوں کو ٹھیس نہ لگے۔ یہاں سزا کا خوف نہیں ہوتا بلکہ محبت کے فقدان کا خوف ہوتا ہے۔ ان معنوں میں خدا ہی کا خوف انسان کو ہر قسم کے خوف حوادث سے نجات دلوا سکتا ہے:

عشق را آتش زن اندیشہ کن　　روبہ حق باش و شیری پیشہ کن
خوف حق عنوان ایمان است و بس　　خوف غیر از شرک پنہاں است و بس

خدا کے سوا کسی چیز سے خائف انسان کلمہ لا الٰہ الا اللہ زبان سے پڑھنے کے باوجود اندر سے شرکِ خفی میں مبتلا ہوتا ہے۔

رموزِ بیخودی میں اقبال پہلے اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ انسانوں میں ملت آفریں وحدت ان مردان حق کی بدولت پیدا ہوئی ہے جنھیں اصطلاحاً نبی کہتے ہیں۔ اس سے قبل اس عنوان کے تحت اشعار

درج ہو چکے ہیں کہ 'ملت از اختلاط افراد پیدا می شود و تکمیل تربیت او از نبوت است' اسلام کا ''رکن دوم'' ''رسالت'' ایک مخصوص تشریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ انبیا تو آدمؑ سے لے کر محمدؐ تک لاتعداد ہوئے ہیں لیکن قرآن کریم نے مسلمانوں کو ملت ابراہیمؑ کہا، اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ کا توحید کی تعمیر اور شرک کی بیخ کنی میں جہاد تاریخ دین کا ایک اہم واقعہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ توریت و انجیل سے پہلے کا زمانہ ہے، اس لیے توحیدی رموز میں ان کو تمام انبیائے بنی اسرائیل پر زمانی سبقت حاصل ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے توحید کی بنیادیں قائم کیں تو اس وقت نہ کوئی یہودی تھا اور نہ کوئی نصرانی۔ یہ سب بعد کے، کم و بیش بھٹکے ہوئے لوگ ہیں۔ اس لیے توحید کو بھی خالص کرنے کے لیے موحد قدیم حضرت ابراہیمؑ کی ہی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ پہاڑ میں سے نکلتے ہوئے چشمے کا پانی صاف ہوتا ہے، بعد میں بہتی ہوئی ندیوں میں خس و خاشاک اور کثافت کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ رسالت کی توضیح میں علامہ اقبال، ابراہیمؑ خلیل اللہ ہی سے آغاز کرتے ہیں:

تارک آفل براہیم خلیلؑ　　　انبیا را نقش پاے او دلیل

جس طرح عقیدۂ توحید وحدت آفریں ہے، اسی طرح رسالت کا بھی یہی وظیفہ ہے کہ ہزار ہا انسان ایک عدل عام اور رحمت عامہ کی سلک میں منسلک ہو جائیں:

از رسالت در جہاں تکوین ما　　　از رسالت دین ما آئین ما
از رسالت صد ہزار ما یک است　　　جزو ما از جزو ما لاینفک است

ابراہیمی رسالت نے جن بنیادوں کو اُستوار کیا اور رسالت محمدیؐ نے ان پر جو عظیم الشان تعمیر انسانیت کھڑی کی، اسی کی بدولت توحید پرستوں کی ایک ملت بن گئی جو اہلِ عالم کے لیے پیامِ رحمت ہے۔ رسولؐ کی محبت خدا کی محبت کا وسیلہ ہے۔ کوئی فرد شاید براہِ راست بھی راہبوں کی طرح خدا سے رابطہ پیدا کرے، لیکن ملت کی شیرازہ بندی تو رسالت ہی ہے:

فرد از حق، ملت از وے زندہ است　　　از شعاع مہر او تابندہ است

رسالت کی بدولت لاتعداد انسان ہم نوا اور ہم مدعا ہو جاتے ہیں۔ کثرت اس وحدت میں آ کر زندہ تر ہو جاتی ہے۔ دین فطرت کا تقاضا اسی قسم کی وحدت آفرینی ہے۔ رسالت محمدیؐ کی پیدا کردہ وحدت اگر ہمارے ہاتھ سے نہ چھوٹے تو ہم ابد پیوند ہو سکتے ہیں۔ افراد پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں لیکن ایسی عالمگیر ملت قائم و دائم رہ سکتی ہے محمد رسول اللہؐ پر رسالت کے مقصد کی تکمیل ہو گئی۔ اس پر اب کوئی انسان بنیادی حقائق کا اضافہ نہیں کر سکتا۔ جس طرح محمدؐ خاتم النبیین ہیں اسی طرح ان کی اُمت خاتم الامم ہے۔ اس کے علاوہ جو ملتیں قائم ہوں گی وہ آئین فطرت کے خلاف ہوں گی، یا جغرافیائی ہوں گی یا نسلی، یا لسانی۔ ان

میں سے کسی کو بقا حاصل نہیں ہوسکتی۔ حق کے مقابل میں باطل کی عمر نہایت قلیل ہوتی ہے۔ اب کوئی نئی نبوت اس سے وسیع تر وحدت پیدا نہیں کرسکتی۔ البتہ کسی جدید دعوائے نبوت سے انسانوں میں مزید تفریق و تفرقہ پیدا ہوسکتا ہے:

لا نبی بعدی ز احسان خدا است — پردہ ناموس دین مصطفیؐ است
قوم را سرمایۂ قوت ازو — حفظ سر وحدت ملت ازو
دل ز غیر اللہ مسلمان می گند — نعرۂ 'لا قوم بعدی' می زند

اس عقیدے کی نسبت یہ اعتراض پیدا ہوسکتا ہے کہ مسلمان تمام نوع انسان تو نہیں۔ مسلمانوں کی باہمی اخوت رنگ و نسل و وطن سے بالاتر سہی، لیکن دُنیا کی کثیر آبادی تو ان سے باہر ہے، اس لیے اسلام کی اخوت عالم گیر اخوت تو نہ ہوئی۔ یہی اعتراض اسرارِ خودی کے انگریز مترجم پروفیسر نکلسن نے کیا تھا۔ اس کا جواب اقبال نے نہایت مدلل اور مسکت دیا تھا کہ اسلام کا مقصود عالم گیر محبت و اخوت ہے لیکن جب تک ایک ملت اس کی مثال قائم نہ کرے اور دوسروں کے لیے نمونہ نہ بنے، تب تک اخوت کی حدیں وسیع نہیں ہوسکتیں۔ اقبال نے اس جواب میں اپنا پختہ یقین بیان کیا کہ میرے نزدیک اُمت محمدیہؐ کا خاص مشن یہی ہے کہ وہ عالم گیر اخوت کے اُصول کا عملی جامہ پہنائے۔ چنانچہ رموزِ بیخودی میں اس مضمون کے لیے ایک خاص عنوان قائم کیا ہے، درمعنی ایں کہ مقصود رسالت محمدیہ تشکیل و تاسیس حریت و مساوات و اخوت بنی نوع آدم است، اس عنوان کے تحت یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اسلام کا پیغام تمام نوع انسان کے لیے آزادی، برابری اور برادری کا پیغام ہے۔ اسلام نے جو کچھ تلقین کی اور اپنی خالص حالت میں جو معاشرت، معیشت اور سیاست پیدا کی اس نے تمام انسانوں کی گردنوں میں سے طوق اور دست و پا سے غلامی اور استبداد کی زنجیریں توڑ دیں۔ انسان انسانوں کی پوجا کرتے تھے۔ ارباب من دون اللہ معبود بنے ہوئے تھے۔ لا قیصر و لا کسریٰ کا اعلان اسلام نے کیا۔ کاہن و پاپا و سلطان و امیر سب مل کر انسانوں کا شکار کرتے۔ کلیسا جنت کے پروانے ابلہان فریب خوردہ کے ہاتھ بیچتا تھا۔ برہمن نجات کے کمیشن ایجنٹ بنے ہوئے تھے۔ مذہب استحصال جاہ و مال کا آلہ بن گیا تھا۔ فطرت انسانوں کو آزاد پیدا کرتی تھی، لیکن وہ مہد سے لحد تک طرح طرح کے توہمات اور استبداد کی زنجیروں میں جکڑے رہتے تھے۔ خدا نے جو امانت آدم کے سپرد کی تھی وہ اس سے چھن چکی تھی۔ جب زبونی حال اس درجے کو پہنچی تو رحمت حق جوش میں آئی اور حق بحق دار سپردن کا دور شروع ہو۔ یہ اسی نبیؐ کی بدولت ہوا جس کو اس کے ہم وطن لوگ نبوت سے قبل بھی امین کہتے تھے:

تا امینے حق بہ حق داراں سپرد — بندگان را مسند خاقان سپرد

اب مکرم و معظم ہونے کا ایک ہی معیار رہ گیا، ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم جو سیرت میں افضل ہے وہی سردار ہے، خواہ وہ ایک نادار حبشی ہی ہو۔ انسانیت کے لیے یہ کام اور کس نے کیا؟ فقط حریت و اخوت و مساوات کے نعرے لگاتے رہے تاکہ اس دھوکے سے عوام کا شکار کرتے رہیں۔ محنت کش کسان اور مزدور کے لیے الکاسب حبیب اللّٰہ کس نے کہا؟ یہ تمام اصنام کہن اسلام نے توڑے۔ یہ کسی ایک ملت پر احسان نہ تھا بلکہ تمام انسانیت میں ایک تازہ جان آفرینی تھی:

تازہ جان اندر تن آدم دمید　　بندہ را باز از خداوندان خرید

اسلام صحیح معنوں میں انقلاب تھا، وہ دُنیائے کہن کی موت اور عالم جدید کی تکوین تھی۔ دین اور ضمیر کے معاملے میں ہر قسم کا جبر ممنوع ہو گیا۔ حریت و مساوات کی تحریکیں عصر نو میں بھی پیدا ہوئی ہیں، لیکن تاریخ انسانی میں یہ تمام تقاضے اسلام کے منشور میں داخل ہو کر پہلے پہل منصۂ شہود پر آئے:

حریت زاد از ضمیر پاک او　　ایں مَے نوشیں چکید از تاک او
عصر نو کایں صد چراغ آوردہ است　　چشم در آغوش او وا کردہ است

جس اسلام نے کل مومن اخوۃ کہا، اسی نے تمام نوع انسان کی وحدت کی حقیقت کا بھی انکشاف کیا کہ تمام انسان، مرد و زن گورے کالے، امیر و غریب ایک نفس واحد کے اعضا ہیں۔ اخوت اور مساوات اسلام کی نہاد میں ہیں۔ جو کوئی جس حد تک اخوت، مساوات اور حریت کو لائحہ عمل بناتا ہے اسی قدر وہ مسلم و مومن ہے۔

اس کے بعد تاریخ اسلام سے مساوات ورزی کی کچھ مثالیں بیان کی ہیں۔ ایرانیوں کے خلاف جنگ میں ان کا سپہ سالار جابان گرفتار ہو گیا۔ اس نے یہ نہ بتایا کہ میں کون ہوں اور ایک معمولی سپاہی سے امان طلبی کی۔ اس نے اسے امان دی اور وعدہ کیا کہ تمھیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ جنگ کے ختم ہونے پر معلوم ہوا کہ وہ اوّل نمبر کا جنگی مجرم ہے۔ سب نے ابوعبیدہ سپہ سالار سے کہا کہ اس کو قتل کرنا لازمی ہے۔ ابوعبیدہ سپہ سالار عسکر اسلامی نے کہا کہ اے مسلمانو! ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ ایک کا وعدہ سب کا وعدہ ہے۔ امان دینے والا معمولی سپاہی سہی لیکن ہماری ملت کا فرد ہے۔ ہمیں اس کا پاس ہونا چاہیے۔ ملت کی یک آہنگی بڑے سے بڑے جبّار قاتل کے قتل کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے:

نعرۂ حیدر نوائے بو ذراست　　گرچہ از حلق بلال و قنبر است
ہر یکے از ما امین ملت است　　صلح و کینش صلح و کین ملت است

اس کے بعد سلطان مراد اور معمار کا قصہ بیان کیا ہے۔ ایک معمار کی تعمیر سلطان کو پسند نہ آئی اور خشم گین ہو کر اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔ اس نے قاضی کے ہاں نالش کی۔ قاضی نے سلطان کو عدالت میں طلب

کیا۔ ایک طرف معمار دست بریدہ وستم رسیدہ فریادی ہے اور دوسری طرف ایک وسیع مملکت کا شہنشاہ شرمندہ کھڑا ہے۔ سلطان نے جرم کا اقبال کیا۔ قاضی نے کہا کہ از روئے قرآن قصاص واجب ہے۔ شریعت سلطان اور معمولی انسان کے حقوق وفرائض میں فرق روانہیں رکھتی:

عہد مسلم کمتر از احرار نیست خون شہ رنگیں تر از معما نیست

سلطان نے اپنا ہاتھ پیش کیا کہ قصاص میں اس کو کاٹ دیا جائے مدعی نے کہا کہ خدا نے قصاص کا حکم بھی دیا ہے لیکن عدل واحسان کو افضل قرار دیا ہے:

گفت از بہر خدا بخشیدمش از برائے مصطفیؐ بخشیدمش
یافت مورے بر سلیمانے ظفر سطوت آئین پیغمبرؐ نگر
پیش قرآن بندہ و مولا یکے ست بوریا و مسند دیبا یکے ست

حریت کی مثال میں اقبال نے امام الشہدا حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے جگر گداز واقعے کو نظم کیا ہے۔ اسلام نے شہنشاہی اور سلطانی کا خاتمہ کر کے انسان کی حریت کو محفوظ کیا تھا، کیوں کہ مطلق العنان سلطانی جو عادل وظالم، عاقل واحمق کو ورثے میں ملتی رہے ہر قسم کے استبداد کا مسموم سرچشمہ ہوتی ہے۔ خلافت راشدہ تک حریت کا یہ عالم تھا کہ معمولی فرد بھی خلیفہ پر نالش کر کے اس کو عدالت میں پیش ہونے پر مجبور کرسکتا تھا اور عورتیں مجمع عام میں امیر المومنین سے معمولی باتوں میں بھی باز پرس کرتی تھیں اور اس کے کسی غیر قرآنی فتویٰ کے خلاف احتجاج کرتی تھیں۔ حضرت عمرؓ جیسے بارعب خلیفہ سے بھی کوئی مرعوب نہ ہوتا تھا بشرطیکہ وہ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھے۔ مساوات وحریت کا یہ نمونہ چشم آفتاب نے اس دُنیا کی سطح پر پھر کبھی نہ دیکھا۔ مگر جب خلافت سلطنت میں تبدیل ہوگئی تو تھوڑے ہی عرصے میں وہی قیصریت واپس آ گئی جس کی بیخ کنی اسلام کا فرض اوّلین تھا۔ ایک مرد مجاہد وحق پرست، رسول اللہؐ و بتول کا پروردہ آغوش اور حیدر کرار کا فرزند ارجمند، اس حریت کشی اور اسلام سوزی کو برداشت نہ کر سکا۔ حضرت امام حسینؓ نے استبدادی سیاست کے خلاف حق کا علم بلند کیا اور حریت کی حفاظت میں اپنی اور اہل وعیال کی جانیں قربان کر دیں۔ مسلمانوں کا ایک گروہ آج تک اس پر ماتم کرتا ہے۔ لیکن اس امام احرار کی حریت پروری اور استبدادی کشی کو کسی نے اپنا مسلک نہ بنایا۔ اب حریت کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہونے کی ضرورت ہے۔

عقل وعشق کا موازنہ اقبال کا ایک خاص مضمون ہے۔ حضرت امام حسینؓ کے ذکر میں بھی شروع میں پندرہ اشعار عقل حیلہ کی تحقیر اور عشق کی مدح میں ہیں۔ اس موازنے میں نہایت لطیف نکات پیدا کیے ہیں۔ اقبال کا مقصود یہ ہے کہ حضرت امام حسینؓ کے اندر عشق کی جذبہ انگیزی اور قوت ایثار کا نقشہ کھینچا جائے۔ اگر حضرت امام حسینؓ میں صرف عقل مصلحت اندیش ہوتی تو کمزور ایمان والے مسلمانوں کی طرح وہ بھی

خاموشی سے یزید کی ولی عہدی کو تسلیم کر لیتے۔ حریت اور عشق ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ حضرت سیّد الشہدا حریت کی حمایت میں انتہائی قربانی پر آمادہ ہوئے۔ یہ جذبہ بھی زندگی کے اعلیٰ اقدار کے عشق ہی کا مظہر ہے:

عشق را آرام جاں حریت است ناقہ اش را ساربان حریت است

دُنیا ہمیشہ خیر و شر کی قوتوں کا میدان کارزار رہی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام فرعون اور حسینؓ و یزید زندگی کی دو مختلف قوتوں کے نمائندے ہیں۔ خلافت کو سلطنت بنا دینا گویا موسیٰ علیہ السلام کے خلاف فرعون کی حمایت کے مترادف تھا:

چوں خلافت رشتہ از قرآن گسیخت حریت را زہر اندر کام ریخت

حریت کا علم بردار سر بکف اٹھا، وہ انسانیت کے لیے ایک سحاب رحمت تھا:

بر زمین کربلا بارید و رفت لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطع استبداد کرد موج خون او چمن ایجاد کرد
ماسوااللہ را مسلمان بندہ نیست پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

علامہ اقبال اپنی شاعری کی ابتدا میں وطنیت کے ترانے الاپ کر بصیرت اندوزی کے ساتھ اس بت پرستی سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ اس انقلاب نظر کے بعد اُنھوں نے فارسی اور اُردو میں وطن پرستی کے خلاف ایک مسلسل جہاد کیا۔ رموزِ بیخودی میں بھی یہ مضمون ایک خاص انداز میں موجود ہے۔ اس سے پہلے وہ کہہ چکے ہیں کہ ملت اسلامیہ ایک ابدقرار ملت ہے کیونکہ اس کی تعلیم حیات ابدی کی تعلیم ہے اور اس کے اُصول فرت کے اُصول ہیں جن کی نسبت قرآن میں ارشاد ہے:

فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیھا۔ لا تبدل لخق اللّٰہ اس سے لازم آتا ہے کہ اس ملت میں کوئی نہایت زمانی نہ ہو۔ اس کے بعد علامہ فرماتے ہیں کہ لازمانی ہونے کی طرح یہ ملت لامکانی بھی ہے یہ کسی خطہِ ارض کے ساتھ وابستہ نہیں:

پاک ہے گرد وطن سے سر داماں تیرا تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا غیر یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا

یہ بانگِ درا وہی لا الٰہ اللہ ہے جس سے ماوریٰ کوئی حقیقت نہیں۔ مسلمان کا وطن اسلام ہے، جس طرح ایک مقتدر اصحابی نے اپنا نسب اسلام بتایا تھا۔ علامہ فرماتے ہیں کہ اسلام ایک روحانی نظریہ ہے اور اس خاک دان سے اس کا کوئی لازمی رشتہ نہیں۔

قلب ما از ہند و روم و شام نیست مرزبوم او بجز اسلام نیست

رسول کریم ﷺ کو حضرت کعب نے قصیدے میں سیف الہند کہا جو فولاد کی خوبی اور تیزی کے لیے مشہور تھی۔ رسول کریم ﷺ نے کہا کہ سیف الہند نہیں سیف اللہ کہو۔ اس سے اقبال نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ اپنے پیغام اور اسلام کو کسی خطہ ارض کے ساتھ وابستہ کرنا پسند نہ فرماتے تھے۔ اسی طرح اس دُنیائے ارض کو ایک مشہور حدیث میں دنیاکم یعنی تمہاری دُنیا کہا ہے۔ جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ اپنے تئیں اس عالم خاکی کا باشندہ نہ سمجھتے تھے۔ وہ یہاں چند روزہ مہمان اور مسافر تھے۔ ہجرت میں بھی یہ تعلیم مضمر تھی کہ اسلام کے مقابلے میں وطن کوئی چیز نہیں۔ رسول کریمؐ نے تمام روئے زمین کو مسجد کہا۔ زمین کا کوئی مخصوص ٹکڑا یا مخصوص معبد ہی خدا کا گھر نہیں۔ جس طرح خدا کسی خطے میں محصور نہیں اسی طرح بندہ خدا کے لیے شرق و غرب برابر ہیں۔ وللّٰہ المشرق والمغرب، فاینما تولوا فثم وجہ اللّٰہ خدا نے جس کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا اس کو مکے سے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ مکے میں رہتے ہوئے بھی خدا دشمنوں کا قلع قمع کر سکتا تھا۔ ہجرت فقط وطن پرستی کے خلاف ایک موثر تلقین تھی:

صورت ماہی بہ بحر آباد شو — یعنی از قید مقام آزاد شو
ہر کہ از قید جہات آزاد شد — چوں فلک درشش جہت آباد شد

اسلام کا مقصود نوع انسان کی وحدت ہے۔ مغرب کی قومیت پروری اور وطن پرستی نے جغرافیائی حدود کے اِدھر اور اُدھر رہنے والوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا۔ اب مجلس اقوام بنا کر اس مہلک بیماری کا علاج کرنا چاہتے ہیں لیکن اصل علاج تب ہوگا جب مجلس اقوام کی جگہ مجلس انسان بنے گی۔ موجودہ مجلس میں تو اقوام ہی کی رسہ کشی اور حیلہ سازی نظر آتی ہے اور ظاہری کوشش صلح گرگ آشتی ہے۔ اصل خلل زاویہ نظر میں ہے:

آں چناں قطع اخوت کردہ اند — بر وطن تعمیر ملت کردہ اند
مردی اندر جہان افسانہ شد — آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت وہفت اندام ماند — آدمیت کم شد و اقوام ماند

مغرب میں دین کو کچھ مادّیت نے سوخت کیا اور کچھ وطنیت نے جو مادّیت ہی کی ایک صورت ہے۔ وطن پرستی اور مملکت پرستی نے مغرب میں شیطان کا ایک مرسل بھیج دیا جس کا نام میکیا ویلی ہے۔ اس نے یہ تلقین کی کہ وطن اور مملکت کی حمایت اور قوت افزائی کے لیے عدل و اخلاق کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیے۔ فرنگ اسی مرسل شیطان کے صحیفے کا معتقد اور اسی پر عامل ہے۔ فرنگیوں کے ہاں مملکت معبود بن گئی ہے۔ مسلمانوں نے بھی اگر اس کی تقلید کی تو وہ بھی دین سے بیگانہ ہو جائیں گے۔

اس کے بعد اقبال پھر اس خیال کی طرف عود کرتا ہے کہ ملت اسلامیہ کبھی زمانے کی دستبرد سے کالعدم

نہیں ہوسکتی۔ قرآن کریم نے اُمتوں کے متعلق ایک کلیہ بیان کیا ہے ولکل امة اجل۔ اذا اجلهم لا یستاخرون ساعة ولا یستقدمون اقبال کہتا ہے کہ ملت اسلامیہ اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ جن اُمتوں کو ازمنہ ماضیہ میں اجل آئی یا آئندہ اجل کا شکار ہوں گی ان کی اساس ابدی حقائق پر نہ تھی۔ اگر اسلام کا چراغ کفر کی پھونکوں سے بجھ نہیں سکتا تو لازم ہے کہ اس پر کاربند اُمت کا چراغ حیات بھی ہمیشہ روشن ہے:

گرچہ ملت ہم بمیرد مثل فرد — از اجل فرماں پذیرد مثل فرد
اُمت مسلم ز آیات خداست — اصلش از ہنگامہ قالوا بلیٰ است
از اجل ایں قوم بے پرواستے — اُستوار از نحن نزلنا ستے

تیرہ چودہ صدیوں میں ملت اسلامیہ پر قیامت خیز آفتیں آئیں، کبھی اپنے اعمال کی پاداش میں اور کبھی حوادث روزگار سے لیکن اس کی راکھ میں جو چنگاریاں تھیں ان کی بدولت پھر نئے سرے سے حرارت حیات پیدا ہوتی رہی۔ یورش تاتار سے صرف بغداد بلکہ عالمی اسلامی کے بیشتر حصے میں ایسی قیامت نازل ہوئی جو روما پر وحشی اقوام کے حملوں سے بھی طاری نہ ہوئی تھی۔ کفار، خلافت کے جذبے اور روح کو ٹھکرا کر مسند نشین ہو گئے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کا چراغ بجھ گیا ہے۔ لیکن دیکھتے دیکھتے یہی آتش تاتار گلزار ابراہیم بن گئی:

آتش تاتاریاں گلزار کیست — شعلہ ہائے او گل دستار کیست

تاریخِ اسلام میں ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ مسلمان ایک طرف کمزور اور بے بس ہوئے تو دوسری طرف ان کا گلبہ ہو گیا۔ اندلس میں ان کا دور دورہ ختم ہو گیا تو مشرقی فرنگ میں ترکوں نے اسلام کے جھنڈے گاڑ دیے۔ اُدھر ترک مشرقی یورپ میں سے نکلے تو دورِ حاضر میں ایک طرف پاکستان جیسی عظیم الشان اسلامی مملکت قائم ہوگئی، دوسری طرف مشرقی اقصیٰ میں انڈونیشیا میں ایک کثیر التعداد اسلامی ملت آزاد ہوگئی:

شعلہ ہائے انقلاب روز گار — چوں بباغ ما رسد گردد بہار

تاریخ عالم نے کئی عظیم القوت ملتوں کو صفحہ ہستی سے مٹایا لیکن:

در جہاں بانگ اذاں بود است و ہست — ملت اسلامیاں بود است و ہست
ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

(حافظ)

اس کے بعد یہ مضمون ہے کہ ملت کی صورت بندی آئین سے ہوتی ہے اور ملت اسلامیہ کا آئین کا مخزن قرآن حکیم ہے:

دہر میں عیش دوام آئین کی پابندی سے ہے — موج کو آزادیاں سامان شیون ہوگئیں

ملتے را رفت چوں آئین ز دست مثل خاک اجزائے او از ہم شکست

قرآن نے اسلام کو دین فطرت قرار دے کر لا تبدیل لخلق اللّٰہ کے اُصول کے مطابق جو سرمدی حقائق حیات بیان کیے ہیں وہ زمانے کے تغیرات کی پیداوار نہیں اور نہ مرور ایام سے ان میں کہنگی پیدا ہو سکتی ہے اسی آئین کو قرآن حکمت بھی کہتا ہے اور حکمت کے مفہوم میں کلیت اور زمان و مکان سے ماورائیت داخل ہے:

آں کتاب زندہ قرآن حکیم حکمت او لا یزال است و قدیم

اس کی تعلیم غلاموں کو احرار بنا دیتی ہے اور ضعیفوں کو قوت بخشتی ہے۔ اس نے ارتقا کی راہیں کشادہ کر دی ہیں۔ اسی کی بدولت ان پڑھ صحرائیوں نے دُنیا میں علوم وفنون کا چراغاں کر دیا۔ موحد بچوں کے سینے بھی اس امانت کے امین ہیں جسے دست وجبل نے زہرہ گداز سمجھ کر قبول نہ کیا تھا۔ تاریخ عالم میں صحرائی اور کوہستانی وحشیوں کے ٹڈی دل کئی مرتبہ متمدن دُنیا پر نازل ہوئے۔ مگر پُرانی تہذیبوں کے تاخت وتاراج کے بعد حیات انسانی میں کوئی وسعت اور ثروت افکار واقدار پیدا نہ کر سکے۔ لیکن ان صحرائیوں نے قرآن سے فیض اور قوت حاصل کر کے قیصر وکسریٰ کے تخت ہی نہیں اُلٹے بلکہ انسانوں کو غلامی کی زنجیروں اور توہمات کے طوق سے آزاد کیا۔ اس وقت جو ملت اسلامیہ میں ضعف نظر آتا ہے تو اس کی وجہ قرآن سے تغافل ہے۔ اب قرآن سے کسی کو وجد نہیں آتا لیکن جامی اور عراقی کی غزلیں قوالی میں چنگ ورباب کے ساتھ گائی جائیں تو ایک جھوٹا جوش اور مستی پیدا ہو جاتی ہے:

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآن زیستن
صوفی پشمینہ پوش حال مست از شراب نغمہ قوال مست
آتش از شعر عراقی در دلش در نمی سازد بقرآن محفلش

خطیب کا کام اب فروعات کی جنگ ہے۔ ضعیف وشاذ ومرسل حدیثوں کی بحث میں قرآن طاق نسیاں پر دھرا رہتا ہے۔ احادیث میں غلو نے یہاں تک نوبت پہنچائی ہے کہ بعض احادیث کو نصوصِ قرآنی کا ناسخ بنا دیا ہے نعوذ باللہ من ذالک:

از خطیب و دیلمی گفتار او با ضعیف و شاذ و مرسل کار او

قرآن اب یا بے سمجھے طوطے کی طرح رٹا جاتا ہے یا کسی مسلمان کی وفات پر ملا حلوا مانڈا اجرت میں لے کر اس کے دو ایک سپارے بڑی سرعت سے پڑھ جاتا ہے یا پھر فال کے لیے استعمال ہوتا ہے یا تبرکاً بیمار کو اس کے اوراق کی ہوا دی جاتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اس کے بعد ایک مضمون ہے جو بظاہر اقبال کی عام تلقین کے منافی معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت اس

میں کوئی تضاد نہیں۔ اقبال نے بالتکرار سینکڑوں اشعار میں تقلید کی مذمت کی ہے اور تحقیق کی رغبت دلائی ہے۔ اجتہاد کے متعلق اقبال کے تصورات خطبات اور اشعار میں ایسے ملتے ہیں جن کو پڑھ کر مقلدوں کو اس کی جرات پر حیرت ہوتی ہے۔ لیکن اقبال جب ملت اسلامیہ کی موجودہ حالت پر نظر ڈالتا ہے تو اسے کوئی گروہ ایسا دکھائی نہیں دیتا جو اسلامی روح کے مطابق اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو اور جو لوگ اجتہاد کی جرات کرتے ہیں وہ آزاد خیالی میں یا تقلید فرنگ میں اسلام سے سے دور جا پڑتے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں کہ ایسی حالت میں ایسے خام مدعان اجتہاد کی بجائے اسلاف کی تقلید بہتر ہے۔ بچوں کی عقل جب تک علم اور تجربے سے پختہ نہیں ہوتی تب تک ان کی تربیت کا مدار تقلید پر ہوتا ہے۔ اس انحطاط کے دور میں بھی اقوام عقل و حکمت کے بارے میں طفل نابالغ بن جاتی ہیں یا پیر فرتوت کی طرح جدت افکار و اعمال کے نا قابل ہو جاتی ہیں۔ جب قوم میں زندگی کے چشمے خشک ہو جائیں تو وہ روایت پرست اور مقلد ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ تقلید اور روایت پرستی میں کسی ہمت اور جرات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مسلمانوں میں اس وقت ایک طبقہ جامد اور کورانہ تقلید اسلاف میں زندگی کی ارتقائی کوششوں کے لیے نا اہل ہو گیا ہے اور دوسرا طبقہ مغرب زدہ روشن خیالوں کا ہے، جن کے لیے تہذیب جدید کا ہر نظریہ اور ہر طرز عمل سند ہے۔ یہ آزاد خیالی کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن درحقیقت یہ بھی مقلد ہی ہیں۔ جب تک قوم میں نئی زندگی اُبھرنے کے سامان پیدا نہ ہوں تب تک ہر طرف مقلد ہی مقلد نظر آئیں گے۔ اگر تقلید ہی کو شیوہ بنانا ہے تو پھر اپنے اسلاف کی تقلید اغیار کی تقلید سے بہتر ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ عہد حاضر کے فتنوں نے ہماری ملت کو اپنے جلوؤں سے چندھیا دیا ہے اور ہمارے باطن کی آگ ٹھنڈی ہو گئی ہے:

جلوہ اش ما را ز ما بیگانہ کرد ساز ما را از نوا بیگانہ کرد
از دلِ ما آتش دیرینہ برد نور و نار لا الا از سینہ برد
مضمحل گردد چو تقویم حیات ملت از تقدیر نمی گیرد ثبات

ماضی کی معتقدانہ تقلید سے جوئے کم آب ہی ملے گی جو ہماری زندگی کو پوری طرح سیراب نہیں کر سکتی لیکن جب دریا ریگستان میں گم ہو گیا تو بچی کھچی چھوٹی سی نہر ہی کی حفاظت کریں:

بحر گم کردی زیاں اندیش باش حافظ جوئے کم آب خویش باش

تقلید کی یہ تلقین ایک مردہ قوم کے لیے ہے۔ اقبال ملت اسلامیہ کو دور حاضر میں مردہ ہی سمجھتا ہے، اگرچہ اس کے احیا سے نا اُمید نہیں۔ اب یہی بہتر ہے کہ اللہ اللہ کرو اور طرز فکر و عمل میں کسی گذشتہ امام کی تقلید ہی کر لو، لیکن یہ تقلید غذائے رُوح نہیں بلکہ مریض میں جو جان کی رمق باقی دکھائی دیتی ہے، اس کو

سنبھالنے کے لیے ایک دوا ہے:

اے پریشان محفل دیرینہ ات مرد شمع زندگی درسینہ ات
نقشِ بر دلِ معنی توحید کن چارہ کار خود از تقلید کن

یہ نصیحت عوام کے لیے ہے جن میں ہماری کم علم اور بے بصیرت علما کا ایک طبقہ بھی داخل ہے۔ الا ماشاءاللہ۔ اس نصیحت کو اقبال اپنے لیے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کا اپنا ذوق تو یہ ہے کہ اجتہاد اور جدت وقدرت میں اگر غلطی بھی سرزد ہو تو وہ اس کو مقلدانہ نیکی پر ترجیح دیتا ہے:

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش براہ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دست تو کار نادر آید گنا ہے ہم اگر باشد ثواب است

چہ خوش بودے اگر مرد نکو پے ز بند پاستان آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوہ خوب پیمبرؐ ہم رہ اجداد رفتے

اتباع آئین کی تلقین پر ایک اور نظم ہے جس میں شریعت اسلام کی ماہیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شریعت اور عشق دونوں کی ماہیت سے ناواقف لوگوں نے ان کو باہم برسر پیکار سمجھ لیا:

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

یہ بحث اسلام سے زیادہ قدیم ہے۔ موسوی شریعت رفتہ رفتہ اس قدر پیچ در پیچ اور زندگی کے لیے جنجال بن گئی اس کی تفصیلی پابندیوں میں رُوح دین غائب ہوگئی۔ حضرت مسیحؑ نے اس ظاہر پرستی اور شعائر پرستی کی شدت کے خلاف احتجاج کیا۔ یہودی علما نے ان پر مخالف شرع ہونے کا الزام لگایا اور ان کو مصلوب کرانے کے درپے ہوگئے۔ ہر چند کہ حضرت مسیحؑ کہتے رہے کہ میں شریعت کو منسوخ کرنے نہیں آیا بلکہ اس کی تکمیل کرنے آیا ہوں۔ میں تمھیں شریعت کے ظاہر کی نسبت اس کے باطن کی طرف متوجہ ہونے کی تعلیم دیتا ہوں۔ حضرت مسیحؑ کے بعد پولوس نے شریعت موسوی سے تنگ آکر یہ اعلان کرنا شروع کیا کہ مسیحؑ کی آمد سے محبت نے شریعت کو منسوخ کر دیا ہے۔ عیسوی تاریخ میں اس کے اچھے نتائج نہ نکلے۔ کسی نہ کسی شریعت کی ضرورت تو زندگی کے لیے لابدی ہے۔ جب قسطنطین کے عیسائی ہونے سے مملکت غارنشیں راہبوں کے ہاتھ آگئی تو ان کو آئین وقوانین وضع کرنے پڑے اور مسیحؑ کی بجائے کلیسا شریعت گر ہوگیا۔

اسلامی شریعت کی نسبت اقبال کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص اسلامی شریعت کے حقائق سے اچھی طرح آشنا ہو تو اس پر یہ حقیقت واضع ہو جائے گی کہ یہاں شریعت اور محبت میں کوئی تضاد نہیں اور شریعت کے ہر حکم کی تہ میں محبت محبت ہی کا جذبہ ہے:

علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست اصل سنت جز محبت ہیچ نیست

اب ہمارے ہاں شریعت کے علم بردار اور مدعی ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کے فروغی مناقشات میں محبت کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ غیر مسلموں اور عام انسانوں سے محبت تو درکنار اپنوں میں تفرقہ اندازی حامیان شریعت کا شیوہ بن گیا ہے۔ لعن وطعن اور تشنیع کا بازار گرم رہتا ہے۔ شریعت اسلامی کی اساس حکمت بھی ہے اور محبت بھی اور اس کا مقصد انسانوں کی قوتوں میں اضافہ کرنا ہے:

قدرت اندر علم او پیداستے ہم عصا و ہم ید بیضاستے

اگر مستحب کی ادائیگی میں کوئی شخص یا گروہ مزاحم ہو تو اس کو ادا کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ دشمن اگر مطمئن اور جنگ کے لیے تیار نہ ہو تو اس کو بے خبر اور کمزور پا کر اس پر حملہ آور ہونا حرام ہے۔ چنانچہ سلطان صلاح الدین نے یروشلم پر حملہ کرنے سے بیشتر دشمن کو پیغام بھیجا کہ اگر تم جنگ چاہو تو میں تم کو اپنی قوتوں کو مستحکم اور منظّم کرنے کے لیے ہر طرح کی آسانیاں مہیا کروں گا، لیکن میں صلح کو اپنے لیے اور تمھارے لیے جنگ کے مقابلے میں بہتر سمجھتا ہوں۔ کمزور جانوروں کے شکار سے شکاری خود سست اور پست ہمت ہو جاتا ہے۔ دشمن کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اُٹھانا اُصولِ شجاعت کے خلاف ہے:

نیست میشے ناتوانے لاغرے درخور سر پنجہ شیر نرے
باز چوں با صعوہ خوگر می شود از شکار خود زبوں ترمی شود

اسلامی شریعت نے رہبانیت کو اس لیے مذموم قرار دیا کہ اسلام سراپا پیغام عمل ہے:

ہست دین مصطفیٰؐ دین حیات شرع او تفسیر آئین حیات
صیقلش آئینہ سازد سنگ را از دل آہن رباید زنگ را

مسلمانوں جب عجم میں پہنچے تو ذوق قوت نزاکت اور لطافت میں منتقل ہو گیا۔ شیرافگن مسلمان نوائے عندلیب سے بے تاب ہونے لگے، یارگ گل سے بلبل کے پر باندھنے لگے:

آ عندلیب مل کر کریں آہ و زاریاں تو ہائے گل پُکار میں چلاؤں ہائے دل
آنکہ کشتے شیر را چوں گوسفند گشت از پامال مورے درد مند
آنکہ از تکبیر او سنگ آب گشت از صفیر بلبلے بے تاب گشت

عجمی تصورات میں لطافت افکار بھی ہے اور پرواز تخیل بھی اور اس کے فن میں ذوق جمال بھی ہے، لیکن اسلام کی شریعت، بصیرت اور قوت سے اس کو لگاؤ معلوم نہیں ہوتا۔ بے چارے مرزا غالب نے صاف طور پر اقبال کیا کہ میں عجمی نہاد ہوں اس لیے دین عربی میرے دل و دماغ میں نہیں گھستا:

رموز دیں نشناسم عجب مدار زمن کہ دین من عربی نہاد من عجمی است

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ احمد رفاعیؒ نے اپنے ایک مرید کو نصیحت کی کہ عجمی افکار سے پرہیز کرنا:

با مریدے گفت اے جان پدر — از خیالات عجم باید حذر
زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گذشت — از حد دین نبی بیروں گذشت

ایک نظم میں اپنے بچپن کے ایک واقعے کو نظم کیا ہے کہ میں نے ایک سائل کو تنگ آ کر زدوکوب کی۔ والد صاحب کو جب معلوم ہوا تو اُنھوں نے عجب مؤثر انداز میں مجھے تنبیہ کی کہ اسلام تو شفقت برخلق کا نام ہے اور اس کا نبی رحمۃ للعالمینؐ ہے۔ جب روزِ محشر میں سب کے سامنے مجھ سے پوچھا جائے گا کہ اپنے بیٹے کی تو نے یہی تربیت کی تھی کہ وہ ایک سائل بےنوا کو مارے پیٹے تو میں کس قدر شرمند ہوں گا۔ قرآن وسنت رحمت وشفقت کی تعلیم ہے:

فطرت مسلم سراپا شفقت است — در جہاں دست و زبانش رحمت است

اقبال نے شمع وشاعر میں ایک شعر کہا تھا:

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار حیات — یہ کبھی شبنم کبھی گوہر کبھی آنسو ہوا

اب اقبال یہ کہتا ہے کہ شبنم اور آنسو بننے سے بہتر ہے کہ قطرہ گوہر بن جائے، لیکن قطرہ آغوش تلاطم میں گوہر بنتا تھا، اس لیے شریعت اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ مزاحمتوں اور خطروں پر غالب آ کر انسان اپنے نفس کو قوی بنائے:

قطرہ نیساں کہ مہجور از یم ست — نذرِ خاشاکے مثال شبنم است
طینت پاک مسلماں گوہر است — آب و تابش از یم پیغمبرؐ است

اس کے بعد ایک نظم میں اس خیال کی توضیح کی ہے کہ حیات ملیہ کے لیے کوئی مرکز محسوس بھی ہونا چاہیے۔ مسلمان کعبے کے سنگ وخشت کی پرستش نہیں کرتا، لیکن یہ مرکز محسوس شرق وغرب اور شمال وجنوب کے لاتعداد مسلمانوں کے لیے ایک نقطہ جاذب ہے جو حیات ملت میں ہم آہنگی اور وحدت کو ترقی دیتا ہے۔

پہلے زندگی کی ماہیت کے متعلق نہایت حکیمانہ اشعار کہے ہیں کہ حیات رم پیہم ہے، مادّہ ہو یا نفس اس میں مسلسل روانی اور تغیر احوال ہے۔ زندگی سراپا پرواز ہے، لیکن نشیمن بھی خود ہی بناتی ہے۔ عارضی طور پر سکون وجمود کی آفرینش کا مقصد بھی یہی ہے کہ ذوق خرام میں فزائش ہو:

پا بگل گردد حیات تیز گام — تا دو بالا گرددش ذوق خرام
زندگی دو ماندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

(میر)

زندگی خود اپنے رشتے میں گرہیں ڈالتی ہے تاکہ گرہ کشائی کی لذت حاصل ہو:

دمبدم مشکل گر و آسان گزار دمبدم نو آفرین و تازہ کار

جس طرح حیات رواں کچھ عرصے کے لیے بدن میں اپنے آپ کو محدود کرتی ہے اسی طرح رُوح ملت کے لیے بھی ایک بدن کی ضرورت ہے۔ بیت الحرام اسی رُوح کا ایک مادّی مرکز و مسکن ہے۔ مختلف قومیں اپنے جھنڈوں کو اقتدار و وقار کا مرئی مرکز بنا لیتی ہے اور جنگ و صلح میں جھنڈے کے وقار کو قومی وقار کی علامت سمجھتی ہیں، حالانکہ مادّی حیثیت میں جھنڈا محض ایک لکڑی کا ٹکڑا اور دو چار گز کپڑا ہوتا ہے۔ بیت الحرام اپنی روایات کے لحاظ سے ان جھنڈوں سے بہتر مرکز عقیدت ہے:

قوم را ربط و نظام از مرکزے روزگارش را دوام از مرکزے
رازدار و راز ما بیت الحرام سوز ما ہم ساز ما بیت الحرام

امتیں جمعیت ہی سے قائم و اُستوار رہتی ہیں۔ بیت الحرام جمعیت میں ایک قومی معاون ہے۔ اُمت موسوی کی جمعیت اس لیے پریشان ہوئی کہ اس کا مرکز اس کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس کا معبد منہدم ہو گیا جس کی باقی ماندہ ایک دیوار پر اس تمام دُنیا کے زائر یہودی سر ٹکرا کر گریہ وزاری کرتے ہیں۔ یہودیوں کی تاریخ سے ملت مسلمہ کو عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ اپنی جان سے زیادہ اس مرکز کی حفاظت کرنا مسلمانوں کا فرض ہے۔ ایک روز علامہ مجھ سے فرمانے لگے کہ صلوٰۃ کا لفظ نماز کے علاوہ معبد کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور قرآن جو صلوٰۃ وسطیٰ کی خاص حفاظت پر زور دیتا ہے میرے نزدیک اس کے معنی بیت الحرام کی حفاظت ہیں۔ وہ معلوم نہیں کہ دیگر مفسرین کہاں تک علامہ کی اس تاویل سے متفق الرائے ہوں گے۔

لیکن کعبہ مسلمانوں کی نظر گاہ نہیں۔ مسلمانوں کا حقیقی نصب العین حفظ و نشر توحید ہے۔ تمام دین توحید کی تشریح ہے اور تمام عبادات و شعائر اسی کو قائم رکھنے کے ذرائع ہیں۔ توحید ہی ملت اسلامیہ کا امتیازی جوہر ہے اور توحید ہی اس کی جمعیت کی شیرازہ بند ہو سکتی ہے۔

زندگی کی حقیقت مقصد کوشی ہے۔ توحید و وحدت آفرینی سے زیادہ بلند اور کوئی مقصود نہیں ہو سکتا۔ تمام مقاصد اسی کے زیر نگیں ہونے چاہئیں۔ ادنیٰ مقاصد ادنیٰ وحدتیں پیدا کرتے ہیں، اعلیٰ ترین مقصد وسیع ترین وحدت حیات پیدا کر سکتا ہے:

چوں حیات از مقصدے محرم شود ضابط اسباب ایں عالم شود

راہ پیمائی کسی منزل ہی کی طرف ہو سکتی ہے۔ اگر منزل معین نہ ہو تو دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ انسان جامد و ساکن ہو کر رہ جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ ہرزہ گرد ہو جائے۔ ''بسکہ دراز اوفتد جادہ زگمراہیم'' (غالب)۔ قیس صحرا میں آوارہ دکھائی دیتا ہے لیکن وہ محمل لیلیٰ کی تلاش میں گرم رو ہے۔ جسم

انسانی کے اندر بھی بے انتہا اور گونا گوں اعمال و وظائف بقائے حیات کے واحد مقصود سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں:

گردش خونے کہ در رگ ہائے ماست تیز از سعی حصول مدعا ست

جس قدر کسی کا مقصد بلند ہوتا ہے، اسی قدر اس کی ہمت اور قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ بقول شاعر:

ہمت بلند دار کہ نزد خدا و خلق باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

جب کسی قوم میں شدید جدوجہد دکھائی دیتی ہے تو اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی شاہد مقصود کی طرف دیوانہ وار بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مقصود کو ہر دم پیش رکھنا چاہیے۔ ایک قدیم صوفیانہ محاورہ ہے کہ جو دم غافل سو دم کافر۔ پاؤں کا کانٹا نکالنے کے لیے ایک مسافر کارواں سے ذرا الگ ہوا تنے میں محمل نظر سے اوجھل ہو گیا اور وہ سو سال تک صحرا میں اس کی تلاش میں حیران و سرگرداں رہا:

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

زندگی مقصد کی جستجو اور تگ و دو میں قرنہا سے تجربے کرتی چلی آ رہی ہے۔ کئی معبودان باطل بنائے اور پھر ان کو توڑ ڈالا، آخر کار اس پیکار حیات نے ارتقاء کی آخری منزل میں انسان کو توحید سے آشنا کیا جو منتہائے حیات ہے والیٰ ربك المنتهیٰ:

مدتے پیکار با احرار داشت با خداوندان باطل کار داشت
تخم ایماں آخر اندر گل نشاند با زبانت کلمہ توحید خواند

توحید کے عرفان ہی سے زندگی میں تمام جمال و جلال پیدا ہوتا ہے۔ اس سرچشمہ حیات کی حفاظت مقصود حیات ہے۔ جب تک تمام عالم پر یہ راز افشا نہ ہو تب تک مسلمان کو دم نہ لینا چاہیے:

زانکہ در تکبیر راز بود تست حفظ و نشر لا الٰہ مقصود تست
تا نہ خیزد بانگ حق از عالمے گر مسلمانی نیاسائی دمے

اسی عقیدے نے انسانوں کو توہمات سے پاک کیا ہے اور ہر قسم کے خوف کو اس کے دل سے دور کیا ہے۔ فکر انسانی بار بار بت گری اور بت پرستی کی طرف عود کرتا ہے۔ پہلے اصنام کو توڑتا ہے تو دوسرے اصنام تراش لیتا ہے۔ عصر حاضر میں فرنگ کی بدولت رنگ و ملک و نسب کی پرستش ہو رہی ہے اور خدا پر عقیدہ تو ہم پرستی شمار ہوتا ہے۔ ان بتوں کو توڑنے کے لیے پھر ایمان ابراہیمی اور توحیدِ محمدؐ کی ضرورت ہے۔ اگر مسلمان نے یہ کام نہ کیا تو اور کون کرے گا؟ اس عرفان کا جائزہ وارث تو وہی ہے، لیکن میراث پدر خواہی علم پدر آموز۔ علامہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس خیال سے لرزہ آتا ہے کہ روز شمار میں جب خدا تم سے پوچھے گا کہ تمھیں پیغامِ حق دیا تھا کہ اسے دوسروں تک پہنچا دو، یہ کام تم لوگوں نے یوں نہ کیا، تو مسلمان کس قدر

شرمندہ اور ذلیل ہوگا۔ دوسروں تک پہنچانا تو درکنار یہاں اپنے اندر ہی سے توحید غائب ہوگئی ہے، کلمہ لا الٰہ زبان پر رہ گیا ہے، باقی سب کچھ یا شرک جلی ہے یا شرک خفی:

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

اس کے بعد اقبال کا خاص موضوع آتا ہے کہ عالم کی قوتوں کی تسخیر کے بغیر حیات ملی میں وسعت اور قوت پیدا نہیں ہوسکتی۔ قرآن نے آدم کو مسجود ملائک اور مسخر کائنات بنایا تاکہ تمام ارضی اور سماوی، مادی اور روحانی قوتوں کی تسخیر سے وہ نائب الٰہی بن سکے۔ رہبانیت نفسی احوال میں مبتلا ہوگئی اور حکمت فرنگ نے تمام قوتیں تسخیر عالم محسوس میں صرف کردیں۔ دونوں طریقوں سے زندگی کی تکمیل نہ ہوسکی۔ ہستی کا ظاہر اور باطن دونوں حیاتِ الٰہی کا انکشاف ہیں۔ ھو الظاھر ھو الباطن حاضر کو غیب کے حقائق کے مطابق ڈھالنا اور دُنیا کو دین بنانا مقصود اسلام اور غایت حیات ہے۔ 'با آسمان پر داختن' کے ساتھ ساتھ 'کار زمین را نکو ساختن' کا عمل بھی جاری رہنا چاہیے۔ فقط با نا دیدہ پیمان بستن سے حیات گریز رہبانیت ہی پیدا ہوسکتی ہے۔ ہندومت، بدھ مت اور عیسائیت کی ابتدا میں ایسا ہی ہوا۔ اسلام نے حاضر کا پیوند غیب سے لگایا اور انفس و آفاق کو ہم آغوش کرنے کی تلقین کی۔ ماسوا نہ فریب ادراک ہے اور نہ حقیقت ابدی ہے۔ اس کی آفرینش کا مقصود ہی یہی ہے کہ اس کی تسخیر سے نفس ترقی کریں:

اے کہ با نادیدہ پیمان بستہ ای ہمچو سیل از قید ساحل رستہ ای
چوں نہال از خاک ایں گلزار خیز دل بغائب بند و با حاضر ستیز
ہستی حاضر کند تفسیر غیب می شود دیباچہ تسخیر غیب
ماسوا از بہر تسخیر است و بس سینہ او عرضہ تیر است و بس

ملت اسلامیہ کے انحطاط کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ فرنگ تسخیر آفاق میں لگا رہا اور اس کی بدولت غیر معمولی قوتیں پیدا کرلیں، مگر مسلمان فقط بے حضور نمازیں پڑھتے رہے یا ظواہر و شعائر کی پابندی میں لگے رہے۔ قرآن نے مشاہدہ کائنات کو عبادت قرار دیا تھا، مسلمان قرآنی آیات کی تلاوت کرتے رہے لیکن عمل دوسروں نے کیا۔ جن قوموں نے خارجی فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا اُنھوں نے مسلمانوں کو بھی آ دبوچا۔ مسلمان بے بس اور مغلوب ہوکر خدا سے شکوہ کرنے لگے کہ یہ کیا بات ہے کہ دوسری امتیں تیرا نام بھی نہیں لیتیں اور باوقار ہیں۔ توحید کی امانت ہمارے سینوں میں ہے لیکن ہم ہی ذلیل ہیں:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
(غالب)

امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں عجز والے بھی ہیں مست مے پندار بھی ہیں

ان میں کامل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں سینکڑوں ہیں جو ترے نام سے بیزار بھی ہے
رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

اس کا جواب خدا نے یہی دیا کہ تمھاری شکایت بے بنیاد ہے۔ کافر کو جو کچھ ملا وہ کفر کا اجر نہیں بلکہ کافر کی زندگی میں اسلامی عناصر کی جزا ہے:

مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

ابھی تک کثرت سے مسلمان اس وہم میں مبتلا ہیں کہ فرنگ مادّہ پرست ہے اور اس کی تمام ترقی مادّی ہے۔ روحانیت اور نجات کے اجارہ دار ہم ہی ہیں۔ یہ چند روزہ دُنیا کا عیش کافروں کے لیے ہے، ابدالا باد تک رہنے والی جنت کے ہم حقدار ہیں۔ قرآن نے کیا خوب کہا ہے کہ یہود و نصاریٰ بھی روحانی اور اخلاقی تنگ نظری سے اسی قسم کے دعوے کیا کرتے تھے:

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد عالمے از ذرۂ تعمیر کرد
عقدہ محسوس را اوّل کشود ہمت از تسخیر موجود آزمود
کوہ و صحرا دست و دریا بحر و بر تختۂ تعلیم ارباب نظر

لیکن مسلمانوں کے لیے مذہب افیون بن گیا، دُنیا اعتنا کے قابل نہ رہی۔ خدا نے فی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة کی دُعا سکھائی تھی اور اس دُعا میں دُنیا کو درست کرنا آخرت پر مقدم رکھا تھا اس لیے کہ دُنیا ہی مزرعہ آخرت ہے۔ اگر کوئی ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا رہے تو اس کی فردا میں ناکردہ کار کو کیا ثمر ملے گا؟ مسلمان نے آخرت پر نظر جمائے ہوئے دُنیا کو کفار کے حوالے کر دیا:

اے کہ از تاثیر افیون خفتہ عالم اسباب را دوں گفتہ
خیز و واکن دیدہ مخمور را دوں مخواں ایں عالم مجبور را
غایتش توسیع ذات مسلم است امتحان ممکنات مسلم است

اگر ملت اسلامیہ آفاقی قوتوں کو مسخر نہ کر سکے گی تو آفاقی قوتوں کی تسخیر سے غیر مسلم اقوام اس کو مغلوب کر لیں گی:

گیر اور را تا نہ او گیرد ترا ہمچو مے اندر سبو گیرد ترا

زندگی میں حاجات اندیشہ و عمل کے توسن کے لیے تازیانہ ہیں۔ آدم کو عناصر پر حاکم بنایا گیا تھا۔ اگر وہ عناصر کی ماہیت سے آشنا نہ ہو اور ان سے کام نہ لے سکے، تو وہ نیابت الٰہی کا کیا حق ادا کرے گا:

تا ز تسخیر قوائے ایں نظام ذو فنونیہائے تو گردد تمام
نائب حق در جہاں آدم شود بر عناصر حکم او محکم شود

اسی ظاہری فضا میں کئی عالم پوشیدہ ہیں۔ ہر ذرّے کے اندر ایک خورشید کی قوت پنہاں ہے۔ اسرار موجودات کی گرہ کشائی سے بصیرت بھی حاصل ہوتی ہے اور قوت بھی۔ بادو باراں اور برق ورعد مطیع وفرماں بردار ہوتے ہیں۔ سیلابوں میں بجلیاں ظہور کے لیے بے تاب ہیں۔ اقوام کہن ستاروں کی پرستش کرتی تھیں لیکن حکمت کی ترقی نے انسان کے ادراک کو ان پر محیط کر دیا:

جستجو را محکم از تدبیر کن انفس و آفاق را تسخیر کن

عرفان وحکمت اشیا کی بدولت ناتواں قومیں غیر معمولی قوت حاصل کر کے بڑی بڑی جابر قوموں کی گردن مروڑ دیتی ہیں۔ شجاعت بے حکمت دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور اقوام حکیم کی باج گزار ہو جاتی ہیں:

تا نصیب از حکمت اشیا برد ناتواں باج از توانایاں خورد

خدا نے مجھے بار بار تاکید کی کہ فطرت کو غور سے دیکھ۔ نباتات، حیوانات، جمادات سب سے آئین الٰہی تلاش کر۔ تو فقط "انظر" والی آیات ہی دہراتا رہا۔ دیکھا دکھایا کچھ نہیں۔ قرآن حکیم فقط تلاوت کے لیے تو نہ تھا، اس کا اصل مقصود صحیفہ فطرت کے مطالعے سے حقائق الٰہیہ کا اخذ کرنا تھا۔ تو نے مشاہدہ کائنات کو کوئی عبادت ہی نہ سمجھا اور اسے دُنیائے دوں کا ایک شغل قرار دیا ہے۔ اب اس کی سزا بھگت رہا ہے:

تو کہ مقصود خطاب "انظری" پس چرا ایں راہ چوں کوران بری

سیّد احمد خان اور مرزا غالب، جن کے انداز فکر، طرز زندگی اور مقصود حیات میں بے حد تفاوت نظر آتا ہے، ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کو محض ایک عسکری کامیابی کا نتیجہ نہ سمجھتے تھے۔ ان دونوں کی بالغ نظری پر یہ منکشف ہو گیا تھا کہ یہ نئی حکمران قوم محض تاجر اور کشور کشا نہیں بلکہ طبعی سائنس کی بدولت فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے بے بصر اقوام پر غالب آ گئی ہے۔ اب مشرقیوں کو ان سے کچھ سیکھنا ہے۔ سیّد احمد خان کو لوگ قابل اعتراض حد تک مداح و مقلد فرنگ سمجھتے تھے لیکن مرزا غالب کی ترقی پسند کی یہ کیفیت تھی کہ جب سیّد صاحب نے آئین اکبری کو تصحیح اور حواشی کے ساتھ پسندیدہ انداز میں شائع کیا اور مرزا غالب کو تقریظ کے لیے یہ کتاب بھیجی تو مرزا صاحب اس قدر برہم ہوئے کہ سیّد صاحب سے قدیم دوستی بھی مخالفانہ تنقید پر غالب نہ آ سکی۔ تعریف کی بجائے اس تقریظ میں، جو غالب کے کلیات فارسی میں شامل ہے، وہ سیّد صاحب کے اس کارنامے پر افسوس کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ 'مردہ پروری' تو عقلمندوں کا کام نہیں۔ یہ پُرانے آئین اب فرسودہ ہو چکے ہیں۔ 'زمانہ دگرگونہ آئین نہاد' اب اس حکمت اور اس قانون پر غور کرو جو حکمت پسند ملت فرنگ اپنے ساتھ لائی ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اس قوم نے فہم فطرت سے تسخیر فطرت کا کام کیا ہے۔ الفاظ ہوا میں اُڑا کر دور دراز مقامات تک پیغام پہنچا دیتے ہیں۔ اس قوم نے حروف

کو پیامبر کبوتر بنا دیا ہے اور ان کے ساز دیکھو کہ بے زخمہ مضراب بجتے ہیں تسخیر فطرت کے مضمون میں علامہ اقبال نے مرزا غالب کے حوالے سے دو چار اشعار لکھے ہیں۔ غالب کے اشعار میں ایک یہ شعر تھا:

حرف چوں طائر بہ پرواز آورند نغمہ را بے زخمہ از ساز آورند

علامہ فرماتے ہیں:

آنکہ بر اشیا کمند انداخت است مرکب از برق و حرارت ساخت است
حرف چوں طائر بہ پرواز آورد نغمہ را بے زخمہ از ساز آورد

سیّد صاحب جب اپنے دو بیٹوں حامد و محمود کو لے کر انگلستان گئے تو وہاں ہر طبقے میں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ انسٹی ٹیوٹ آف انجینئر نے بھی ان کے اعزاز میں ایک ڈنر دیا جس میں زیادہ تر ماہر انجینئر ز ہی مدعو تھے۔ سیّد صاحب کو وہاں کچھ تقریر کرنا پڑی اس تقریر میں سیّد صاحب نے کہا کہ تمھاری قوم کو اپلائڈ سائنس اور انجینئر نگ کی بدولت عروج اور غلبہ حاصل ہوا ہے۔ برق اور بھاپ سے کام لینے والے اور ریلیں، تلغراف اور پل بنانے والوں نے تمھاری سلطنت کو قوت بخشی ہے۔ اپنے وطن میں سیّد صاحب کی کوششوں کا محور بھی یہی تصور تھا کہ اسلام بھی مسلمانوں سے یہی تقاضا کرتا تھا لیکن افسوس ہے کہ وہ اس سے غافل ہر کر ضعیف اور مغلوب ہو گئے۔ عقائد و اخلاق کو مغرب سے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں، اس کا قیمتی سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے، لیکن تسخیر فطرت سے روگردانی کی وجہ سے یہ کیفیت ہوگئی ہے کہ زندگی کی دوڑ میں ہم لنگڑے بن گئے ہیں۔ حکمت آشنا سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے ہم اس آدم کے وارث نہیں رہے جس کی نسبت قرآن نے علم آدم الاسما کہا تھا۔ یہ اسما محض نام اور الفاظ نہ تھے بلکہ صفات اشیا و حوادث کا علم تھے۔ جن اقوام نے اس حقیقت کو پالیا وہ ہم سے آگے نکل گئیں اور ہم پسماندہ قوم رہ گئے:

اے خرت لنگ از رہ دشوار زیست غافل از ہنگامۂ پیکار زیست
ہمر ہانت پے بہ منزل بردہ اند لیلیٰ معنی ز محمل بردہ اند
تو بصحرا مثل قیس آوارہ خستہ واماندہ بیچارہ
علم اسما اعتبار آدم است حکمت اشیا حصار آدم است

اقبال فرنگ کی سائنس اور اس سے پیدا شدہ تسخیر فطرت کا مخالف نہیں، وہ جس حکمت فرنگ کے خلاف احتجاج کرتا ہے وہ مادّیت کا نظریہ حیات ہے جو خارجی فطرت کے ایک غلط تصور سے پیدا ہوا۔ خود فرنگ کے اکابر حکماء اور سائنس دان اس فلسفے پر ویسی ہی تقلید کرتے ہیں جو اقبال کے کلام میں ملتی ہے اور اپنے انگریزی خطبات میں اقبال نے زیادہ تر انھیں حکمائے فرنگ کی با لگ نظر کے نمونے پیش کیے ہیں۔

اس کے بعد رموزِ بیخودی میں یہ مضمون ملتا ہے کہ جس طرح تکمیل ذاتِ کے لیے فرد کو احساس

خودی پیدا کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح ملت کی بھی ایک خودی ہے جو افراد کی خودی سے وسیع تر اور قوی تر ہے۔ اس کی تکمیل بھی لازمی ہے اور یہ تکمیل تسخیر فطرت کے علاوہ ضبط روایات ملیہ ہی سے ہوسکتی ہے۔ پہلے کچھ اشعار میں یہ بتایا ہے کہ فرد کی خودی کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ بچہ اپنی حقیقت سے کچھ واقف نہیں ہوتا، اس کا کام کھانا سونا اور بات کرنا سیکھنے کے بعد ہر چیز کے متعلق سوالات کرنا ہے، یہ کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟ اور یہ کیسے ہے؟ ان سوالات کی کثرت سے ماں باپ زچ آجاتے ہیں۔ زندگی کا یہی آئین ہے۔ پہلے تمام توجہ خود پر مبذول ہوتی ہے اور اپنے 'من' کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ کسی قدر فہم ماسوا کے بعد بچے میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ میں 'میں' ہوں تمام دیگر نفوس اور اشیا سے الگ ایک ہستی رکھتا ہوں، ماضی حال اور مستقبل سب اس 'میں' کی لڑی میں پروئے جاتے ہیں۔ مسلسل جسمانی تغیرات اور بدنی نشوونما کے باوجود وہ اپنی خودی کو ایک غیر متغیر اور مستقل چیز سمجھتا ہے:

یاد او با خود شناسایش کند　　حفظ ربط دوش و فردایش کند
گرچہ ہر دم کاہد افزاید گلش　　من ہمانستم کہ بودم در دلش
این 'من' نوزادہ آغاز حیات　　نغمہ بیداری ساز حیات

ملت نوزائیدہ بھی کمسن بچے کی طرح ہوتی ہے، اس کا نہ کوئی ماضی ہوتا ہے اور نہ اسے مستقبل کا کوئی واضح احساس ہوتا ہے۔ دیروز و امروز و فردا کا شیرازہ بند 'انا' ابھی اس میں نہیں ہوتا، 'بستہ با امروز او فرداش نیست'، اس کی ہستی جسمانی آنکھ کے مماثل ہوتی ہے جو ہر شے کو دیکھتی ہے لیکن اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتی:

چشم ہستی را مثال مردم است　　غیر را بینندہ و او خود گم است

جب کوئی ملت حوادث و افکار کی پیکار میں کچھ عرصہ بسر کر چکتی ہے تو اس کے اندر ایک 'ملی انا' کا شعور ترقی کرتا ہے۔ قوم اپنی سرگزشت سے افکار و تاثرات کی ثروت حاصل کرتی ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے ماضی کو فراموش کر دے یا کوتاہ بینی سے عملاً اپنا رشتہ اس سے منقطع کر لے تو وہ نابود ہو جاتی ہے:

سر گزشت او گر از یادش رود　　باز اندر نیستی گم می شود

حفظ روایت کی سوزن سے ربط ایام کا پیرہن تیار ہوتا ہے جو ناموس ملت کا محافظ بھی ہوتا ہے اور اس کے لیے باعث تزئین بھی۔ نافہم لوگ تاریخ کو محض پُرانی داستانیں سمجھتے ہیں اور ھذا اساطیر الاوّلین کہہ کر اس کی حقیقت سے غافل رہتے ہیں۔ تاریخ تو ایک ملت کا حافظہ ہے، فرد میں سے حافظہ غائب ہو جائے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ قوم بھی اگر اپنی تاریخ سے غافل ہو جائے تو اس کا بھی یہی حال ہوگا۔

تاریخ ایک ساز ہے جس کے تاروں میں تمام نغمہ ہائے رفتہ اسیر ہوتے ہیں۔ صدیوں کی پُرانی شراب اس کے خم و مینا میں ہوتی ہے، اس کی کہنگی مستی میں اضافہ کرتی ہے:

بادۂ صد سالہ در مینائے او مستی پارینہ در صہبائے او

زندہ قوموں کو دیکھو کہ کمال جدت پسندی کے ساتھ ساتھ اپنی روایات کے متعلق کس قدر قدامت پرست ہوتی ہیں۔ دوش و امروز کا پیوند نفس ملت میں لذت اور قوت پیدا کرتا ہے۔ ہر قوم کا حال اس کے ماضی کی پیداوار ہے اور اس کا مستقبل اس کے ماضی و حال کا نتیجہ ہوگا۔ یہ وسعت زمانی اور ہزار سالہ حوادث کی حافظے میں یکجائی حیات ملی کی کفیل ہوتی ہے:

سر زند از ماضی تو حال تو خیزد از حال تو استقبال تو
مشکن ار خواہی حیات لازوال رشتہ ماضی ز استقبال و حال

لیکن قومی روایات کی حفاظت اس انداز کی نہیں ہونی چاہیے کہ ملت ماضی پرست ہو کہ جامد ہو جائے اور زندگی کے ہر نئے اقدام کو یہ کہہ کر ٹھکرا دے کہ ہمارے قدیم عقائد و اعمال ہمارے لیے کافی ہیں۔ ماوجدنا علیه آبائنا ہر نبی کے مخالفوں نے یہی راگ الاپا۔ قرآن نے اس روایت پرستی کی شدید مذمت کی ہے اور تاریخ سے عبرت اور نصیحت حاصل کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ اقبال جیسے جدت پسند اور انقلاب آفریں انسان کے ہاں حفظ روایات کا کوئی جامد مفہوم نہیں ہے۔ زندگی اپنے کسی انداز کو جوں کا توں نہیں دہراتی۔ ماضی سے صحت مندانہ ربط حیات آفرین ہوتا ہے لیکن ماضی کی مقلدانہ پرستش حیات ملی کو جامد کر دیتی ہے۔

غیر مسلم اور متعصب مخالفین اسلام نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ اسلام نے عورت کو بہت ادنیٰ مرتبہ دیا ہے۔ اس اعتراض کا نشانہ مسلمان اس لیے بنے کہ اُنھوں نے اپنی معاشرت میں اسلام سے بیگانہ ہوتے ہوئے عورتوں کو رسوم و رواج اور مردانہ خودغرضی کے پیدا کردہ غلط آئین کی بدولت بہت کچھ بے بس بنا دیا۔ اسلام نے جو حقوق عورتوں کو عطا کیے تھے۔ مسلمانوں نے رفتہ رفتہ ان کو سلب کر لیا اور ان نادانوں اور ہوس پرستوں کی وجہ سے اسلام بدنام ہو گیا۔ اسلام میں عورت اور ماں کا جو رتبہ ہے اس پر اقبال نے رموزِ بیخودی میں ایک بلیغ نظم لکھی ہے۔

خدا نے مرد و زن کو ایک دوسرے کا لباس بنایا، ان میں سے ہر ایک دوسرے کے بغیر اقدار حیات کے لباس سے عریاں ہو جاتا ہے۔ عشق حق کا آغاز ماں کی محبت سے ہوتا ہے:

عشق حق پروردہ آغوش او

رسول کریم ﷺ نے خوشبو، نماز اور عورت کی مثلث مقدس کو اس دُنیا کی پسندیدہ چیزیں قرار دیا ہے۔ یہ تینوں جسمانی اور روحانی لطافتوں کا جوہر ہیں۔ جس مسلمان نے عورت کو محض اپنا پرستار اور اپنے ادنیٰ اغراض کا تختۂ مشق سمجھ لیا وہ قرآن کی حکمت سے بے بہرہ رہا:

مسلمے کو را پرستارے شمرد بہرہ از حکمت قرآن نہ برد

اسلام نے جنت کا مقام ماں کے قدموں کے نیچے قرار دیا۔ اُمت اور امومت میں گہرا معنوی ربط ہے۔ نبی کی شفقت اپنی اُمت پر بھی مادرانہ شفقت ہوتی ہے۔ سیرت اقوام انبیا کی تعلیم اور مثال سے بنی ہے یا اچھی ماؤں کی شفقت اور تربیت سے:

شفقت او شفقت پیغمبر است سیرت اقوام را صورتگر است
ہست اگر فرہنگ تو معنی رسے حرف اُمت رازہا دارد بسے

انسانی روابط میں محبت کا رشتہ قائم کرنے کے لیے قرآن تکریم ارحام کی تعلیم دیتا ہے۔ انسانی زندگی میں امومت کا یہ مقام ہے کہ اگر کوئی بے علم ماں جو ظاہری حسن و جمال نہ رکھتی ہو، سادہ اور کم زبان ہو لیکن ایک غیور مسلمان حق پرست اس کے بطن سے پیدا ہو اور اس کی آغوش میں پرورش پائے تو بقا و احیائے ملت کے لیے ایک اتنا عظیم الشان کارنامہ ہے کہ بڑے بڑے تعمیری کام اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں جن پر مرد فخر کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اگر کوئی نازک اندام، پری و بعض مغربی عورتوں کی تقلید میں تہی آغوش رہے اور بار امومت کو اپنے لیے بار خاطر سمجھے تو اسے عورت نہیں کہنا چاہیے۔ ایسی عورت انسانیت کے لیے باعث شرم ہے حیانا آشنا آزادی ملت کشی کا سامان ہے۔ بے شمار ارواح جو وجود پذیر ہونے کے لیے مضطرب ہیں وہ امہات کی بدولت عالم ممکنات سے عالم وجود میں آتی ہیں۔ کسی قوم کا سرمایۂ نقد و قماش وسیم و زر نہیں بلکہ اچھے انسان ہیں جو خیابان ریاض مادر سے گل و لالہ کی طرح چمن افروز ہستی ہوتے ہیں۔

جس قوم میں عورتوں کی زندگی احترام سے محروم ہے وہاں مردوں کو بھی حیات صالح نصیب نہیں ہو سکتی۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ کسی قوم کی تہذیب کو جانچنے کا صحیح معیار یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس میں عورت کا کیا مقام ہے، اگر عورت ذلیل ہے تو قوم بھی ذلیل اور تہذیب سے عاری ہے:

بردمد ایں لالہ زار ممکنات از خیابان ریاض امہات
قوم را سرمایہ اے صاحب نیست از نقد و قماش وسیم و زر
مال او فرزند ہائے تندرست تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست
حافظ رمز اخوت مادراں قوت قرآن و ملت مادراں

مسلمان عورتوں کے لیے اسوہ کاملہ سیّدہ النسا فاطمۃ الزہراؓ ہیں۔ عیسوی دُنیا مریم طاہرہ و صدیقہ کی پرستش کرتی ہے، مسلمانوں کے دلوں میں بھی حضرت مریم کا بڑا احترام ہے اور یہ فقط اس نسبت سے ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں ہیں اور ان کی عفت کا خدا شاہد ہے۔ لیکن فاطمۃ الزہرا تین بلند پایہ نسبتوں کا مرکز ہیں، ایک عظیم المرتبت نبیؐ کی بیٹی، علیؓ جیسے جلیل القدر انسان کی بیوی اور امام الشہدا حضرت امام

حسینؓ کی ماں۔ تمام دُنیا کی تاریخ کوٹٹو لیے اور قسم کی تین نسبتیں ایک عورت میں کبھی جمع نہ پاؤ گے۔ حضرت امام حسینؓ کی حریت آموز سیرت کا سرچشمہ اخلاق پدر بھی ہے اور اخلاق مادر بھی لیکن ماں کی سیرت فرزند میں زیادہ موثر ہوتی ہے اس لیے کہ بیداری شعور سے پہلے اس کے اثرات تحت الشعور میں مرتسم ہو جاتے ہیں:

سیرت فرزند ہا از امہات　　جوہر صدق و صفا از امہات

فاطمۃ الزہرا ایک یہودی محتاج کی مدد کے لیے اپنی چادر فروخت کر ڈالتی ہیں، عرب کے بادشاہ کی بیٹی ہیں لیکن کوئی خدمت گار نہیں۔ قرآن کی آیات دہرائی ہوئی چکی پیستی رہتی ہیں:

آں ادب پروردہ صبر و رضا　　آسیا گردان و لب قرآن سرا
رشتہ آئین حق زنجیر پاست　　پاس فرمان جناب مصطفیٰؐ ست
ورنہ گرد تربتش گردیدمے　　سجدہ ہا بر خاک او پاشیدمے

اس کے بعد مسلمان عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے اقبال ان کو دور حاضر کے فتنوں سے آگاہ کرتا ہے جو عورت کی طینت پاک کی تخریب کے در پے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تقلید فرنگ پر مسلمان عورت دین و اخلاق سے کنارہ کش ہو کر جھوٹی آزادی کے چسکے میں اپنی پاکیزہ فطرت کو خیر باد کہہ دے:

دور حاضر تر فروش و پر فن است　　کاروانش نقد دیں را رہزن است
کور و یزداں ناشناس ادراک او　　ناکساں زنجیری پیچاک او
ہوشیار از دستبرد روزگار　　گیر فرزندان خود را در کنار

نسوانی فطرت میں خدا نے بلند جذبات رکھے ہیں، ان کی حفاظت فاطمۃ الزہرا کے نمونے پر زندگی بسر کرنے ہی سے ہوسکتی ہے۔ اگر اس فطرت کو پاک رکھا گیا تو حسینؓ من انسان آغوش مادر میں تربیت حاصل کر سکتے ہیں:

تا حسینے شاخ تو بار آورد　　موسم پیشیں بگلزار آورد

سورۂ اخلاص توحید کی تعلیم کا لب لباب ہے۔ قرآنی فصاحت کا کمال ہے کہ چار مختصر جملوں نے توحید کے قلزم ذخار کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ تمام قرآن توحید ہی کی تشریح ہے اور تمام حکمت بھی توحید ہی کے اندر پنہاں ہے۔ دین کی اصل توحید ہے باقی جو کچھ ہے وہ اس کی فرع ہے اس لیے مثنوی رموزِ بیخودی کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال نے سورۂ اخلاص ہی کی مختصر مگر بلیغ شرح لکھی ہے۔

فرماتے ہیں کہ مجھے خواب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دیدار نصیب ہوا، میں نے عرض کیا کہ آپ نے اسلام کی اساس کو پختہ کرنے میں غیر معمولی بصیرت و ہمت و ایثار سے کام لیا، اب اس ملت کی بنیادیں

متزلزل ہو رہی ہیں، اس تعمیر کو سنبھالنے کے لیے کوئی علاج تجویز فرمایے:

پختہ از دستت اساس کار ما چارۂ فرما پے آزارِ ما

اس کا جواب یہ ملا کہ مسلمان اس توحید سے بیگانہ ہوگئے جو وحدت آفرین تھی۔ اسلام نے نسلی اور قبائلی امتیازات کو مٹا کر ایک ملت بنائی تھی لیکن اب تمہارا یہ حال ہے کہ تم پھر قبائل پرستی پر اُتر آئے ہو۔ گویا اسلام سے قبل کے زمانہ جاہلیت کی طرف عود کر آئے ہو جس میں سب سے زیادہ مؤثر جذبہ قبیلوی عصبیت تھا:

خویشتن را ترک و افغان خواندۂ وائے بر تو آنچہ بودی ماندہ
با یکی ساز از دوئی بردار رخت وحدت خود را مگرداں لخت لخت

زبان سے وحدت کا کلمہ پڑھتے ہو اور عمل سے ملتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہو۔ توحید اگر وحدت ملت میں مشہود نہ ہوئی تو وہ محض ایک لفظ بے معنی رہ گئی۔ جو ایمان عمل میں منعکس نہ ہو وہ ایمان ہی مردہ ہے:

صد ملل از ملتے انگیختی بر حصار خود شبخون ریختی
یک شو و توحید را مشہود کن غائبش را از عمل موجود کن
لذت ایمان فزاید در عمل مردہ آں ایمان کہ ناید در عمل

اللّٰہ الصمد

صمد کے معنی ہیں وہ ہستی جو کسی غیر اور ماسوا کی محتاج نہ ہو مگر تمام مخلوقات و موجودات اپنے وجود کے لیے اس کے محتاج ہوں۔ تخلقوا باخلاق اللہ کی تعلیم کے مطابق مسلمان کو بھی اپنے اندر یہ بے نیازی کی صفت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انسان کو حاجات کا شکار نہیں ہونا چاہیے، احتیاج انسان کے نفس کو کمزور کر دیتی ہے اور تمام قوت و محبت اور ایثار کو سلب کر لیتی ہے۔ بے نیازی مال و جاہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ ''آنانکہ غنی تر اند محتاج تر اند'' یہ طبیعت کا ایک انداز ہے جو نادار کو قارون پر فضیلت بخشتا ہے۔ اسی بے نیازی کی بدولت انسان راست باز ہوتا ہے، خوددار ہوتا ہے اور نشتر 'لا و نعم' اس کے سینے میں نہیں چبھتا۔ دُنیا عالم اسباب ہے لیکن انسان کو بندہ اسباب نہیں بننا چاہیے:

بندہ حق بندۂ اسباب نیست زندگانی گردش دولاب نیست
مسلم استی بے نیاز از غیر شو اہل عالم را سراپا خیر شو

رزق کے لیے دوسروں کے آگے دست سوال دراز کرنا خودی کو سوخت کر دیتا ہے۔ دانا مسافر کو جب دشوار گزار راستوں سے دور دراز کا سفر درپیش ہوتا ہے تو اشد ضروری چیزوں کے علاوہ فالتو سامان اپنے اُوپر

نہیں لادتا۔ سفر زندگی میں بھی فروانی سامان سے آسائش کی کوشش نہ کرو، یہ سامان تمہارے لیے گلے کا طوق اور زنجیر پا ہو جائے گا۔ فراوانی کی کوشش تم کو حقیر انسانوں کے سامنے نیاز مند بنا دے گی:

گرچہ باشی مور و ہم بے بال و پر حاجتے پیش سلیمانے مبر
راہ دشوار است سامان کم بگیر در جہاں آزاد زی آزاد میر

حکیم سقراط کا بھی ایک قول مشہور ہے کہ کم احتیاج انسان الوہیت کے صفات سے بہرہ اندوز ہوتا ہے کیوں کہ خدا بھی بے احتیاج ہونے کی وجہ سے بے نیاز ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی یہی نصیحت فرماتے تھے اور اس کا بہترین نمونہ خود تھے: اقلل من الدنیا تعش حرا۔ دُنیاوی حاجتوں کو کم سے کم کرو، آزادی اور حریت کی زندگی اسی طرز عمل سے حاصل ہوتی ہے۔ مردِ حُر کو فقط اتنے ہی مال کی ضرورت ہے جو اس کو سائل اور گداگر ہونے سے محفوظ رکھے۔ مال کا مصرف یا خدمت خلق ہے یا اپنی خود داری کی حفاظت مگر مال کی محبت کے بغیر منعم ہونا سائل ہونے سے بہتر ہے:

تا توانی کیمیا شو گل مشو در جہاں منعم شو و سائل مشو

بے نیازوں کی جائز ضرورتیں پورا کرنے کا مشیت الٰہی میں ایک پنہاں قانون موجود ہے:

خود بخود گردد درمیخانہ باز برتہی پیمانگان بے نیاز

رسول کریم ﷺ سے زیادہ مال سے بے نیاز شخص کون ہوگا لیکن خدا نے ان کی ہر ضرورت بڑی ہو یا چھوٹی، بے منت غیرے ہمیشہ پوری کی۔ جو شخص چاہے کاہلانہ بے پروائی نہیں بلکہ عارفانہ بے نیازی کو شیوہ بنا کر اس کو اپنی زندگی میں آزما کر دیکھ لے۔ یہاں بوعلی قلندر کا ایک شعر علامہ اقبال نے نقل کیا ہے:

پشت پا زن تخت کیکاؤس را سربدہ از کف مدہ ناموس را
اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

خلیفہ ہارون الرشید کے سوانح حیات میں لکھا ہے کہ اس نے امام مالک سے درخواست کی کہ دارالخلافت بغداد میں آ کر اپنی مسند بچھایے، یہاں بڑی رونق اور زندگی کی گہما گہمی ہے۔ یہاں ہر قسم کی قدردانی ہوگی۔ اس مرد خوددار اور عاشق رسولؐ نے مدینے سے ہلنا گوارا نہ کیا۔ فرمایا کہ میں یہاں بندۂ آزاد ہوں اور میرا سر آستانہ رسولؐ پر ہے۔ عشق خدا و رسولؐ مجھے کہتا ہے کہ تو بادشاہوں کو اپنا خدمت گزار بھی نہ بنا، چہ جائیکہ میں بادشاہوں کا ملازم ہو جاؤں۔ اگر علم دین کا شوق ہے تو یہی مدینے میں تشریف لایئے، پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے، کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا:

تو ہمی خواہی مرا آقا شوی بندہ آزاد را مولا شوی
بہر تعلیم تو آیم بر درت خادم ملت نگردد چاکرت

بہرہ خواہی اگر از علم دین درمیان حلقہ درسم نشیں
بے نیازی رنگ حق پوشیدن است رنگ غیر از پیرہن شوئیدن است

اے مسلمان تیری ذلت کا سبب یہی ہے کہ تجھ میں خودداری کا فقدان ہے۔ اغیار کے علوم پڑھتے ہو اور مقلدانہ فطرت کی وجہ سے ہر خیال کو بے چون و چرا قبول کر لیتے ہو۔ اغیار کے شعار سے ارجمند ہونا چاہتے ہو۔ تمہاری عقل افکار غیر سے پابہ زنجیر ہے تمہاری زبان پر جو باتیں ہیں وہ تمہارے اپنے دل و دماغ کی پیداوار نہیں، تمہاری آرزوئیں بھی دوسروں سے مستعار لی ہوئی ہیں:

بر زبانت گفتگوہا مستعار در دل تو آرزو ہا مستعار

اے مسلمان تو اپنے نبیؐ کا فرمان بھول گیا ہے جو شخص دوسری اقوام سے مشابہت پیدا کرتا ہے وہ انہیں میں سے ہو جاتا ہے اور ملت اسلامیہ کا فرد نہیں رہتا:

لست منی گویدت مولائے ما خاک بردی کیمیا درباختی
فرد فرد آمد کہ خود را وا شناخت قوم قوم آمد کہ جز با خود نساخت

لم یلد و لم یولد

خدا کے ہاں صلبی پیدائش کا کوئی سوال نہیں، علامہ فرماتے ہیں کہ مردموحد خدا کی اس صفت سے بھی ایک سبق حاصل کر سکتا ہے۔ جسمانی لحاظ سے تو ہر انسان کسی کا بیٹا اور کسی کا باپ ہے لیکن یہ جسمانی ولدیت بہت ثانوی چیز ہے۔ حضرت سلمان فارسی سے لوگوں نے ان کا شجرہ نسب پوچھا تو اُنھوں نے جواب دیا ''سلمان ابن اسلام''۔ مسلمان کی اصل نسبت اسلام سے ہے، اب وام سے نہیں۔ توحید پر ایمان لانے سے ایمان کی کیفیت شہید کی سی ہو جاتی ہے جس میں ہزاروں پھولوں کا رس اس طرح آمیختہ ہے کہ کوئی قطرہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری اصل لالہ ہے یا گلاب یا نرگس۔ لم یلد و لم یولد کا پرتو اگر مومن کی زندگی پر پڑے تو اس کے احساس ملی میں نسب کوئی مقام نہ ہو:

قوم تو از رنگ و خوں بالا تر است قیمت یک اسودش صد احمر است
قطرہ آب وضوے قنبرے در بہا بر تر ز خون قیصرے
گر نسب را جزو ملت کردہ رخنہ درکار اخوت کردہ

مسلمان کا نہ کوئی وطن ہے اور نہ کوئی رشتہ نسب اس کے لیے کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا وطن بھی اسلام اور اس کا نسب بھی اسلام۔ عشق محمدؐ اس تمام ملت کا شیرازہ بند ہے جو اطراف و اکناف عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں عقائد اور فقہ میں بہت سے اختلاف پائے جاتے ہیں اور ہر

فرقہ وجہ اختلاف کو اس قدر اساس تصور کر لیتا ہے کہ اس کو کفر و اسلام کا معیار بنا لیتا ہے۔ خدا کی ذات و صفات کے متعلق بھی تصورات میں بے حد تفاوت پایا جاتا ہے۔ لیکن شاید ہی کوئی شخص اسلام دُنیا میں ایسا مل سکے جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا ہو اور محبت رسولؐ سے اس کا دل بالکل خالی ہو۔ راقم الحروف کو ایسے مسلمانوں سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا ہے جو جدید الحادی تعلیم کی بدولت دین کے بنیادی عقائد سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے لیکن ناموس رسولؐ پر جان قربان کرنے کو تیار تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ نفسیات اس بارے میں کیا کہتی ہے کہ بے دین ہونے کے باوجود ذکر رسولؐ پر میری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ عقائد سے معرا ہونے کے باوجود یہ شخص ملت اسلامیہ کے مفاد کے لیے سراپا ایثار تھا۔ مسلمان کی اسی نفسیات کو، جسے الحاد بھی بدل نہ سکا، اقبال نے ان اشعار میں پیش کیا ہے:

دل بہ محبوب حجازی بستہ ایم — زین جہت با یک دگر پیوستہ ایم
عشق او سرمایۂ جمعیت است — ہمچو خون اندر عروق ملت است

ترک فرنگ آلودہ ہو جائے یا چینی اشتراکیت کی لپیٹ میں آ جائے لیکن جب کبھی نسل و نسب میں مختلف کسی مسلمان سے ملتا ہے تو اس کے سینے میں اخوت کے جذبے کی ایک لہر پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب اس رشتے کی بدولت ہے جو عشق محمدیؐ نے پیدا کیا:

با شیر اندرون شد و با جاں بدر شود

(حافظ)

عشق در جان و نسب در پیکر است — رشتہ عشق از نسبت محکم تر است
عشق درزی از نسب باید گذشت — ہم ز ایران و عرب باید گزشت
ہر کہ پا در بند اقلیم و جد است — بے خبر از لم یلد و لم یولد است

ولم یکن له کفواً احد

تمام موجودات میں خدا کا کوئی ہمسر نہیں۔ یہ صفت بھی مرد مومن میں پیدا ہو جاتی ہے۔ لا لہ سر کوہسار کی طرح وہ کسی گلچیں کے دامن میں نہیں پڑتا۔ وہ جہاں کے اندر ہے لیکن جہاں سے الگ اور بالاتر ہے۔ مومنوں کی ملت اسی طرح بے ہمتا ہو سکتی ہے کہ اس انداز کی کوئی اور ملت نہ ہو:

رشتہ با 'لم یکن' باید قوی — تا تو در اقوام بے ہمتا شوی
آنکہ ذاتش واحد است ولاشریک — بندہ اش ہم در نسازد با شریک

مومنوں کے متعلق جو انتم الاعلون کی بشارت دی گئی ہے، اس کے یہی معنی ہیں کہ وہ نہ صرف دوسری ملتوں بلکہ فطرت کی تمام قوتوں سے بالاتر ہے۔ جس مومن اور جس ملت کے یہ صفات بیان کیے گئے ہیں وہ

اس وقت تو پردۂ عالم پر کہیں نظر نہیں آ رہی۔ مردِ مومن کی پرواز تو ایسی فلک رس ہونی چاہیے کہ اس کا طائر رُوح ستاروں میں دانہ چینی کرے بلکہ اپنی بلند پروازی میں افلاک کو پیچھے چھوڑ جائے۔ لیکن اس وقت مسلمان کا یہ حال ہے جیسے مٹی کے اندر بسنے والا کیڑا ہو جو فضائے ارضی سے بھی نا آشنا ہے۔ اپنے آپ کو پسماندہ اور ذلیل پا کر گردشِ ایام کا شکوہ کرتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ قرآن کو ترک کرنے کی وجہ سے اس کی یہ گت بنی ہے۔ مردِ مومن کی پرواز کا تو یہ حال ہے کہ:

طائرش منقار بر اختر زند　　　آنسوئے ایں کہنہ چیز پر زند
تو بہ پروازے پرے نکشودۂ　　　کرمک استی زیرِ خاک آسودہ
خوار از مہجوری قرآں شدی　　　شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی

مثنوی کے اختتام میں بحضور سرورِ کائناتؐ مصنف کی عرضِ حال ہے۔

ویسے تو اقبال کا تمام کلام خلوص سے لبریز ہے اور اس کی دلدوز تاثیر اسی خلوص کی بدولت ہے۔ محض فن اور صناعی سے یہ دل رسی پیدا نہیں ہو سکتی لیکن اس عرضِ حال میں خلوص اور عشقِ رسولؐ کا ایک ایسا ولولہ ہے کہ پڑھنے والے حساس انسان کی آنکھیں نمناک ہو جاتی ہے۔ اقبال کی صحبت سے فیض یاب احباب سب نے یہ دیکھا کہ شبابِ غفلت انگیز کے دور سے لے کر شیبِ عرفان اندوز تک اس عاشقِ رسولؐ کی یہی کیفیت رہی کہ رسولؐ کا نام سنتے ہی طبیعت پر رقت طاری ہو گئی، خواہ اقبال اس وقت رندوں کی محفل ہی میں ان کا ہم مشرب بن کر بیٹھا ہو۔ اس عرضِ نیاز میں پہلے عشق سے لبریز کچھ اشعار کہے ہیں، اس کے بعد اپنی داستانِ درد بیان کی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ اقبال کے معتقدین اس کو عارف باللہ اور مجددِ عصر سمجھنے لگے تھے اور اس کی خامیوں کا ذکر اس کی توہین شمار ہوتا تھا لیکن لوگوں کی عقیدت سے ناجائز فائدہ اُٹھانا کبھی اقبال کا شیوہ نہ تھا، دمِ واپسیں میں وہ اپنی تمام حالت کو طشت از بام کرتا ہے اور اپنی تمام عمر پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ اپنا نامہ اعمال اس ہستی کے سامنے رکھتا ہے جو نا گفتہ بھی اس کے حال سے آشنا ہے۔ اپنی حالت کے ساتھ ساتھ ملت کی خدستہ حالی کو بھی پیش کرتا ہے۔ نہ اپنے متعلق کسی غلط تفاخر سے کام لیتا ہے اور نہ ملتِ اسلامیہ کو اس کی موجودہ حالت میں وہ اسلام پر عمل پیرا سمجھتا ہے۔ اقبال کے نزدیک ملت کا حال اس زمانے میں ایک جسدِ بے رُوح کی طرح ہے۔

شروع یہاں سے کرتا ہے کہ جب سے میری نظر کے سامنے رسول اللہؐ کی ہستی آئی تب سے میری یہی کیفیت ہے کہ رسولؐ مجھے ماں باپ سے زیادہ محبوب ہو گئے:

عشق در من آتشے افروخت است　　　فرصتش بادا کہ جانم سوخت است

میری یہ کیفیت اس زمانے میں بھی تھی جب میں حسینوں سے عشق بازی کرتا تھا، ان کی صحبت میں

شراب پیتا تھا:

مدتے با لالہ رویاں ساختم عشق با مرغولہ مویاں باختم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم بر چراغ عافیت داماں زدم

شباب کی ان ہوس رانیوں کے ساتھ ساتھ میرے تفکر اور عقائد کی یہ حالت تھی کہ عقل صنم تراش نے مجھے پجاری بنا لیا تھا۔ مگر خالی عقل وظن انسان کو کسی یقین تک تو نہیں پہنچاتے، چنانچہ میں بھی یقین وایمان سے خالی حقائق حیات کے بارے میں شک میں گرفتار تھا اور یہ تشکیک میرے تفکر کا جزو لاینفک بن گئی تھی۔ ظن وگمان کے سوا میرے پاس کچھ نہ تھا۔ ایک طرف حسینوں کا عشق ہوس پرور اور دوسری طرف عقل آزر پیشہ، ان دو بجلیوں نے میرا حاصل سوخت کر دیا تھا، میرا متاع خیال ودماغ ان دو ڈاکوؤں کی دست برد سے نہ بچا:

برقہا رقصید گردِ حاصلم رہزناں بردند کالائے دلم
عقل آزر پیشہ ام زنار بست نقش او در کشورِ جانم نشست
سالہا بودم گرفتارِ شکے از دماغِ خشک من لاینفکے
حرفے از علم الیقین ناخواندۂ در گماں آباد حکمت ماندۂ

ایک عرصے تک اس ظلمت عقل وہوس میں گمراہ رہنے کے بعد مجھے توفیق الٰہی سے ایمان ویقین حاصل ہوا اور اسرار قرآن مجھ پر منکشف ہونے لگے۔ مجھے جو بصیرت حاصل ہوئی میں نے اسے آب حیات سمجھ کر اس مردہ قوم کے حق میں ٹپکایا، مبدءِ فیاض نے نواگری عطا کی تھی، میں نے شمع نوا سے محفل میں روشنی پیدا کی:

مردہ بود، از آب حیواں گفتمش سرے از اسرار قراں گفتمش
محفل از شمع نوا افروختم قوم را رمز حیات آموختم

لیکن افسوس کہ اس مردہ قوم کو زندہ نہ کر سکا، اب اس کی نعش کو میں حضورؐ کے سامنے لایا ہوں کہ آپؐ ہی اس کے احیا کا کوئی سامان پیدا کریں۔ مجھے اسرار قرآنی پیش کرنے کا اس مردہ قوم سے یہ صلہ ملا کہ لوگ کہنے لگے کہ یہ شخص فرنگستان سے کچھ باتیں سیکھ آیا ہے، اپنی شاعری سے وہی جادو ہم پر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ساز میں سے جو آواز نکلتی ہے وہ حکمت قرآنی نہیں بلکہ ساز فرنگ کی غوغا آرائی ہے:

گفت برما بندد افسون فرنگ ہست غوغایش بہ قانون فرنگ

جس قوم کا یہ حال ہو اس کو میرے جیسا نواگر بے عمل کیا زندگی بخشے گا۔ مسلمان توحید ونبوت کے اسرار سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ اس نے بیت الحرام کو بت خانہ بنا دیا ہے۔ اپنے آپ کو موحد اور برہمن کو مشرک

اور بت پرست کہتا ہے لیکن ہمارا شیخ، برہمن سے زیادہ کافر ہے۔ ایک پورا سومنات اس کے مغز کے اندر موجود ہے۔ کچھ عجمی تصورات کو اسلام سمجھ کر اپنے فکر وعمل انھیں کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ اس کے اندر قلب زندہ نہیں رہا، وہ کافر کی طرح موت سے ترساں ولرزاں ہے۔ یہ کافر مسلم نما مجھ پر یہ الزام لگاتا ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ قرآن کی تعلیم کا ثمرہ نہیں ہے۔ اگر اس بارے میں میں نے اپنے آپ کو اور قوم کو دھوکا دیا ہے تو اے محبوب خداؐ اس کی سزا یہ ہے کہ دُنیا اور آخرت میں سب کے سامنے رسوا کیا جاؤں:

گر دلم آئینہ بے جوہر است — در بحرفم غیر قرآن مضمر است
پردہ ناموس فکرم چاک کن — ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خوا و رسوا کن مرا — بے نصیب از بوسہ پا کن مرا

ملت کی اس خستہ حالت کو بیان کرنے کے ساتھ ہی اپنی اس کوتاہی کو بھی حضور سرور کائنات میں پیش کیا ہے کہ میری زندگی میں میرا عمل اس عشق وعرفان کا مظہر نہیں جو مجھے عطا ہوا اور جس سے میں نے دوسروں کو بھی زندہ کرنے کی کوشش کی۔ میری یہ عرض خدائے عزجل کے سامنے پیش کر دیجیے کہ عشق اور علم کی دولت دی ہے تو عمل کی توفیق بھی عطا ہو:

عرض کن پیش خدائے عزوجل — عشق من گردد ہم آغوش عمل
دولت جان حزیں بخشندہ ای — بہرہ از علم دیں بخشندہ ای
در عمل پاینده تر گرداں مرا — آب نیسانم گہر گرداں مرا

ایک آرزو میرے دل میں ہمیشہ چٹکی لیتی رہی، لیکن میں شرم کے مارے اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میرے اعمال میرے علم وعشق کے مقابلے میں نہایت پست تھے:

زندگی را از عمل ساماں نبود — پس مرا ایں آرزو شایاں نبود
شرم از اظہار او آید مرا — شفقت تو جرأت افزاید مرا

آرزو یہ تھی اور ہے کہ میری موت حجاز میں واقع ہو۔ تیرے دیار کے باہر تو مجھے دیر ہی نظر آتا ہے۔ بہت افسوس ہوگا کہ اگر میرے جسم کو بت خانے میں گاڑا جائے۔ اگر میں جو روضہ رسولؐ میں مدفون ہوں اور قیامت کے روز میرا حشر وہیں سے ہو تو میں اسے کمال سعادت سمجھوں گا:

حیف چوں او را سرآید روزگار — پیکرش را دیر گیرد در کنار
از درت خیزد اگر اجزائے من — وائے امروزم خوشا فرداے من
کو کہم را دیدۂ بیدار بخش — مرقدے در سایہ دیوار بخش

افسوس ہے کہ اقبال کی اس آرزو کا اس انداز میں پورا ہونا تقدیر الٰہی میں نہ تھا، لیکن اس ہیچمدان کے

نزدیک اس کی آرزو پوری ہوئی۔ اقبال کی تعلیم یہ تھی کہ مومن کا پیوند کسی خاک سے نہیں ہوتا۔ مومن کے تمام روابط رُوحانی ہوتے ہیں۔ اقبال کو عالم گیر کی عظیم الشان شاہی مسجد کے سایہ دیوار میں مرقد نصیب ہوا۔ ہر مسجد خدا اور رسولؐ کا گھر ہے۔ یہ مسجد لاتعداد مسلمانوں کے درود وسجود کا محل ہے۔ رُوحانی لحاظ سے یہ بھی روضہ رسولؐ کا قرب ہے۔

اقبال جو اپنی بےعملی کا مسلسل اعلان کرتے رہے راقم الحروف اس سے متفق نہیں۔ کیا انسانوں کی بصیرت افروزی، ملت کی ہمت افزائی، عشق کی فراوانی اور ارزانی، تفکر کی وسعت اور ثروت، اعمال صالحہ میں داخل نہیں؟ میرے نزدیک یہ عمل ہزار عالموں، عابدوں، زاہدوں اور صوفیہ کی ریاضتوں سے زیادہ باقیمت ہے۔ معلوم نہیں کہ علامہ اقبال اس کو کیوں عمل شمار نہ کرتے تھے۔ میرے نزدیک اقبال کے عارفانہ اور عاشقانہ کلام کا ہر شعر عبادت میں داخل ہے۔ اس سے زیادہ خدمت خلق اور کیا ہوسکتی ہے کہ رہتی دُنیا تک لوگ اس کے کلام سے بلندترین افکار اور تاثرات حاصل کرتے رہیں گے۔ یہ صدقۂ جاریہ ہے مومن کی زندگی کا نصب العین علامہ اقبال کے نزدیک اتنا بلند تھا کہ وہ اس عرش بوس بلندی کے مقابلے میں اپنے تئیں پستی میں محسوس کرتے تھے۔ مقصود کی بلندی کسی اعلیٰ درجے کے محسن انسان کو بھی اپنی زندگی سے مطمئن نہیں رہنے دیتی۔ خوب تر کے مقابلے میں خوب بھی ناخوب دکھائی دیتا ہے۔ اقبال کے کلام سے بعض افراد کی زندگی میں ایک انقلاب آفریں ہیجان پیدا ہوا۔ آئندہ بھی ملت اسلامیہ کے ہر انقلاب میں اقبال موجود ہو گا۔ جس شخص کا پیغام سراپا پیغام عمل ہو، کیا وہ سرچشمہ عمل خود عمل سے محروم ہے؟ لوگوں نے جس چیز کو عمل سمجھ رکھا ہے وہ اس حیات افزا پیغام وتلقین کے مقابلے میں اکثر پست ہی ہوتا ہے۔ اقبال کو اپنی بےعملی پر جو افسوس ہے وہ اس کی علو ہمت اور رفعت مقاصد کا نتیجہ ہے۔ جن لوگوں کے مقاصد پست ہوتے ہیں وہ ان مقاصد کے حصول میں سرگرم عمل رہتے ہیں اور جو کچھ حاصل ہو جائے اس سے مطمئن بھی ہو جاتے ہیں لیکن گناہوں سے پاک اور اگلی پچھلی خطائیں بخشا ہوا نبی اپنی رُوحانی ترقی میں کسی موجودہ حالت پر قانع نہیں ہوتا اور گنہگاروں سے زیادہ استغفار اس کا صبح وشام کا وظیفہ ہوتا ہے۔ عمل میں کوتاہی کا احساس ایمان کی قوت اور مقصد کی بلندی کا شاہد ہے، ادنیٰ درجے کے لوگ جن اعمال کو حسنات شمار کرتے ہیں، بلند مقصد اور بلند حوصلہ انسانوں کو ان میں سیئات کا رنگ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔